اردو اور انگریزی میں روزنامچہ نویسی کی روایت

کیا روزنامچے تاریخ کی سچی شہادت ہیں؟

اردو میں روزنامچہ نگاری:

روزنامچہ کیا ہے؟ اس کے فوائد کیا ہیں؟ کیا اردو زبان میں روزنامچے کی روایت بہت قدیم ہے یا اس کے آغاز کو محض چند عشرے گزرے ہیں؟ کیا اردو کے قدیم روزنامچے تلف ہو گئے یا طاق نسیاں کی زینت بنے رہے۔ ان سوالات پر جب کوئی محقق غور کرتا ہے تو اسے ان سوالوں کے مبہم، غیر تسلی بخش نا کافی جوابات ملتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو زبان میں روزنامچے کی روایت پر کوئی اہم تحقیقی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ عام طور پر خواجہ حسن نظامی اور مولوی مظہر علی سندیلوی کے روزنامچے معروف ہیں اور انہی روزنامچوں کو اردو زبان میں روزنامچہ نگاری کا نقطہ آغاز سمجھا گیا ہے۔ لیکن یہ نقطہ نظر تاریخی طور پر درست نہیں، اردو میں روزنامچہ نگاری کی روایت نہایت قدیم ہے جس کی بازیافت پر توجہ کی ضرورت ہے۔ مظہر علی سندیلوی کے روزنامچے کی شہرت کا ایک اہم سبب اس کی ضخامت تھی۔ ۷۹۹ صفحات پر مشتمل یہ روزنامچہ جو ۱۹۱۱ء میں تکمیل پذیر ہوا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں نور الحسن ہاشمی نے تلخیص و تعارف کے ساتھ ''ایک نادر روزنامچے'' کے نام سے شائع کیا۔[۱]

اس روزنامچے کے تعارف میں نور الحسن ہاشمی نے لکھا تھا کہ

> ''یہ بیک وقت ایک تاریخ بھی ہے ایک سوانح عمری بھی اور زندگی کی داستان بھی''[۲]

روزنامچہ کیا ہے؟ روزنامچہ نگاری کیا ہے؟

روزنامچہ نگاری کی حقیقی ضرورت و اہمیت کا اندازہ خواجہ حسن نظامی کی درج ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

> ''میں نے جب کبھی اپنی زندگی کا روزنامچہ لکھا تو محسوس ہوا گویا اپنے عرفان ہستی کا کھاتہ لکھ رہا ہوں کیوں کہ جب اس کو دیکھتا ہوں آمد و خرچ کا حساب یاد

آ تا ہے۔[۳]

حقیقت یہ ہے کہ روز نامچہ نگار اپنی ہستی کے عرفان کا کھاتہ ہی نہیں لکھتا بلکہ اپنے عہد، معاشرت، ماحول، زمانے، ثقافت کا عرفان بھی ہمیں عطا کرتا ہے۔ روز نامچہ نگار اپنا روز نامچہ اس یقین کے ساتھ قلم بند کرتا ہے کہ یہ صفحات روئے زمین پر اس کے سوا کوئی نہیں پڑھے گا۔ لہٰذا یہ روز نامچے ایسے لافانی حقائق، ابدی سچ، بے لوث سچائی، بے چون و چراء صداقتوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔

ان روز نامچوں میں صرف روز نامچہ نگار کی باطنی حالت ہی تحریر نہیں ہوتی بلکہ اس کے خاندان، اس عہد اس زمانے اور اس خطے کے نفسانی، روحانی، جسمانی، انسانی معاملات بھی بلا کم و کاست تحریر کیے جاتے ہیں۔ بے شمار روز نامچہ نگار اپنی زندگی میں روز نامچے تلف کرتے رہتے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں لیکن انھیں ہمیشہ روز نامچے تلف کرنے کی مہلت نہیں ملتی کیونکہ اچانک مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے اور یہ روز نامچے ردی والوں کے ذریعے مورخین کی دسترس میں آ جاتے ہیں۔ روز نامچہ نگاری روز نامچہ نویس کی ذات کی تطہیر کا عمل بھی ہے، اس کے نفس کا تزکیہ اور تصفیہ بھی بلکہ اس عہد اس خاندان اور اس دور کا آئینہ بھی لیکن روز نامچہ نگار نہ ناصح مشفق بننا چاہتا ہے نہ واعظ معجز بیاں وہ ایک ناظر کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتا، سنتا، محسوس کرتا ہے خون دل میں انگلیاں ڈبو کر، آنسوؤں کے موتیوں سے اپنی تنہائیوں میں اجالا کر کے ان تجربات، مشاہدات، حادثات کو قلم بند کر دیتا ہے۔

روز نامچے، روز نامچہ نگاری: ردی والے

یہ موضوع بھی نہایت دلچسپی کا حامل ہے کہ روز نامچہ نگار کے گھر والے اپنے عزیز کی نجی باتوں کو عام کیوں کر دیتے ہیں؟ وہ ان روز نامچوں کو تلف کیوں نہیں کرتے؟ اس سوال کی مختصر تحقیق مختلف تہذیبوں اور معاشروں میں کی گئی تو یہ انکشاف ہوا کہ ردی والے ان روز نامچوں کو محفوظ کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، گھر والے یہ روز نامچے ردی سمجھ کر پھینک دیتے ہیں انھیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ جو سامان پھینکا جا رہا ہے اس میں ان کی رسوائی اور عزت افزائی کے کتنے سامان ارزاں ہیں۔ اہل علم انھیں ردی والوں سے خرید لیتے ہیں۔ علم و تحقیق کے فروغ میں ردی والوں کا کردار مغرب و مشرق میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ افسوس کہ اس جانب سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ''روز نامچہ ایک ایسی چیز ہے جو آپ بیتی، تاریخ نویسی، تاریخ نگاری، صحیفہ نویسی، صحافت نگاری کے قریب تر پہنچتی ہے اور اس میدان میں سفر نامہ، رپورتاژ، خطوط، ملفوظات وغیرہ کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے۔ روز نامچہ ایک حد تک غیر مدون خود نوشت اور تاریخ کا خاکہ کہا جا سکتا ہے۔

آپ بیتی، خطوط نگاری روز نامچے میں فرق:

روز نامچہ فی الحقیقت عرفان ہستی کا یومیہ زائچہ ہوتا ہے جو ہر قسم کے تصنع، ملمع کاری، بناوٹ، نمود

ونمائش سے پاک ہوتا ہے اسے ہم خالص تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں جس میں ایک فرد نہ صرف اپنی ذات کا حساب کتاب رکھتا ہے بلکہ اپنے عہد اپنے معاشرے اپنے زمانے کی تاریخ معاشرت تمدنی حوادث، آفات، واقعات، سانحات کا دفتر بھی محفوظ کرتا ہے۔عموماً روزنامچہ اشاعت کی غرض سے نہیں لکھا جاتا اس کا مقصد اپنی وضاحت کرنا برتری جتانا دوسروں کی رہبری کرنا بھی نہیں ہوتا اس کا محرک محض ایک خلش، اضطراب، بے چینی اور وہ بے تابی ہے جو روزنامچہ نگار کے قلم کو متحرک کرتی ہے۔

کیا روزنامچہ آپ بیتی، سفرنامے، رپورتاژ، خطوط، ملفوظات، وقائع نگاری، تاریخ نویسی، تاریخ نگاری، صحیفہ نگاری سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے؟ کیوں کہ روزنامچے کا زندگی سے بڑا قریبی اور نہایت گہرا تعلق ہے۔اس کا تسلسل اور بے ربطی اور نشیب وفراز بھی زندگی کی طرح ہوتے ہیں۔یوں تو خطوط بھی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں مگر خطوط لکھتے وقت مخاطب کا تصور ذہن میں ضرور رہتا ہے لیکن روزنامچے میں لکھنے والا خود اپنی ذات سے مخاطب ہوتا ہے۔اس لیے آخرالذکر سے صحت بیان کی زیادہ توقع کی جاتی ہے۔[۴]

عموماً آپ بیتی، تاریخ نگاری، خودنوشت، خاکہ نگاری میں بہت سے واقعات ذہن سے اتر جاتے ہیں یا ان کی اصل تصویر نہایت دھندلا جاتی ہے۔اور واقعات کچھ سے کچھ شکل اختیار کر لیتے ہیں مطالب بدل جاتے ہیں تفصیلات مٹ جاتی ہیں جزئیات محو ہو جاتی ہے یا قصداً بہت سے واقعات نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔یا انھیں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی اصل حیثیت کھو دیتے ہیں لیکن روزنامچہ ان عیوب ونقائص سے پاک ہوتا ہے کیوں کہ ''ان میں روزانہ کی حرکات اور واقعات جو لکھنے والے کے مشاہدے یا علم میں آتے ہیں قلم بند کیے جاتے ہیں۔ان کی خوبی یہی ہے کہ یہ ذاتی تاثرات کو جبکہ وہ ابھی تازہ ہی ہوتے ہیں قلم بند کر کے اسے ایک نعمت غیر مترقبہ کے طور پر محفوظ کر لیتے ہیں اور تجربات مابعد کی روشنی میں ان کے ازسرنو جائزے کا موقع دیتے ہیں۔[۵]

خطوط میں کوئی مخاطب ہوتا ہے لہذا مکتوب نگار اس کی شخصیت، مزاج، عادات نفسیات کے مطابق بہت سی باتوں کو حذف کر دیتے ہیں یا قصداً بیان نہیں کرتے۔یا گریز کا ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ اصل بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے یا رنگینی بیان سے اس معاملے کی اصل صورت بگڑ جاتی ہے آپ بیتی شخصیت کی جلوہ نمائی ہوتی ہے لہٰذا آپ بیتی لکھنے والے عموماً دروغ گوئی کو خوشگوار معصیت تصور کر لیتے ہیں اور اس تصور کو عقیدے کے طور پر برتتے ہیں۔آپ بیتی بغرض اشاعت لکھی جاتی ہے اور اشاعت کی نیت اس کے خلوص کو کم کر دیتی ہے۔آپ بیتی لکھنے کا مقصد اپنی وضاحت کرنا۔برتری جتانا یا دوسروں کی رہبری کرنا ہوسکتا ہے۔[۶]

روزنامچوں کی اہمیت: ضرورت

روزنامچے سے ہم کسی بھی عہد کی روزانہ زندگی، زندگی کے معمولات اس میں برپا تغیرات کی جھلک

صدیوں بعد بھی دیکھ سکتے ہیں۔ Arthur نے اپنی کتابوں They year of endurance [1]، The Years of victory[2]، The age of elegance.[3] میں اپنے عہد کے بے شمار مطبوعہ غیر مطبوعہ قلمی روزنامچوں سے استناد کیا ہے۔ روزنامچوں کے ذریعے صدیوں پہلے گزرے ہوئے زمانے کی معمولی باتیں، جزئیات کی تفصیل، نہایت باریک بینی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ علم بشریات اور عمرانیات وسماجیات کے ماہرین کے لیے ان روزنامچوں کے بغیر عہد ماضی کا علمی تجزیہ ممکن نہیں ہے۔

Parson wood forde کے روزنامچے کے بغیر ہم اٹھارہویں صدی کی متوسط اشرافیہ کے حالات، ماحول، اخلاقیات، تہذیب، معاشرت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ Parson Teonges کے روزنامچے سے ہمیں سترہویں صدی کی سمندری زندگی کے اسرار رموز سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس عہد میں سپاہی سمندروں میں کس طرح جنگ لڑتے تھے اور کس طرح شب و روز بسر کرتے تھے۔ ان کی امیدیں، تمنائیں، دعائیں، آنکھ کے آنسو، دل کی دھڑکنیں، آنکھوں کے حلقے، مچلتے ہوئے ہونٹ، ابلتے ہوئے جذبات، کس طرح رات کی تنہائیوں میں اجالا کرتے تھے۔

Edard VI:The Chronical of Edward VI کا روزنامچہ ۱۵۳۷ء سے ۱۵۵۳ء کے حالات سے آگاہ کرتا ہے، اس عہد کی جنگیں قتل وخون اور اس کی شخصیت کے اسرار ورموز اس کے بین السطور میں جھلکتے ہیں۔ یہ انگریزی زبان کا قدیم ترین روزنامچہ ہے۔ James Boswell کا روزنامچہ Journal of a Tour to the Hebrides اور Macready کا روزنامچہ اپنے ہیرو اور اپنی ذات کے گرد گھومتے ہیں، ایک روزنامچہ میں دوسرے کی پرستش ہے دوسرے روزنامچے میں اپنی ہی پرستش کا صور پھونکا گیا ہے۔

Dr laver Morris ایک مقامی معالج تھا اس کا روزنامچہ طبی اور عمومی نوعیت کی نہایت قیمتی معلومات مہیا کرتا ہے۔ اس عہد کی بیماریاں، علاج کے سادہ طریقے، صحت یابی کی شرح اور بیماروں کی اوسط تعداد ہمیں معلوم ہو جاتی ہے۔

Francis Kilvert کے روزنامچے سے وکٹورین دور کی بازیافت ہوتی ہے۔

King Edward اور Queen Victoria کے روزنامچے ہمیں اس عہد کی تاریخ، اخلاقیات، طاقت کے مظاہر، اور مقتدر قوتوں کے طرز زندگی وطرز معاملات سے آگاہ کرتے ہیں۔ Humphry Davy کا روزنامچہ جس میں نائٹرس اوکسائیڈ کے ابتدائی تجربات کی جزئیات تک محفوظ ہیں۔ سائنسی ایجادات کے حیرت انگیز طریقوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ Fanny Burney کا روزنامچہ جو George III کے دربار میں گزارے ہوئے دنوں کی یادوں کو تازہ کرتا ہے۔ سلاطین اور شہنشاہوں کے ناز نخروں اور غیر فطری زندگی سے واقف کراتا ہے۔

General Godons کا روزنامچہ جو سقوط خرطوم سے چند روز پہلے لکھا گیا۔ بتاتا ہے کہ ایک بہادر سپاہی موت کے سائے میں بھی اپنے معمولات ترک نہیں کرتا اور شب و روز معمول کے مطابق بسر کرتا ہے۔ بلنٹ کا روزنامچہ جاسوسی کی جدید شکلوں سے آگاہ کرتا ہے۔ بلنٹ برطانوی حکومت کے ایجنٹ کے طور پر عالم

اسلام کے اہم لوگوں سے ذاتی تعلقات رکھتا تھا جس میں جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ وغیرہ شامل تھے۔ بلنٹ کی اہلیہ بھی جمال الدین افغانی سے مانوس تھیں اور ان کے تعلقات افغانی سے گھریلو نوعیت کے بھی تھے۔ جمال الدین افغانی کے سفر ترکی، مہدی سوڈانی کے محاصرے سے جنرل گورڈن کی رہائی کے سلسلے میں بلنٹ کا روزنامچہ اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ روزنامچہ عالم اسلام کی اہم شخصیات کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہے۔

عمدہ روزنامچے کی خصوصیات:

Vicent Waite نے ایک عمدہ روزنامچے کی خصوصیات بتاتے ہوئے لکھا ہے:

In a good diary the more the writer reveals about himself the more we are interested.

عمدہ روزنامچہ نگار وہ ہے جو

Can reveal wonderful surprising and interesting adventure hopes, tears, reflections and dislikes to nobody.

A good diary does not need to be written in a literary style.

It need not even "Literature" It shall shown the leaving personality of the diarist.

مشہور زمانہ برطانوی سپہ سالار General Gordon خرطوم میں مہدی سوڈانی کی سپاہ کے ہاتھوں محصور ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ محصوری کے ان دنوں میں اس نے روزنامچہ نگاری کا کام تسلسل سے جاری رکھا۔ روزنامچے کے آخری ورق پر ۱۴ر دسمبر ۱۸۸۵ء کی تاریخ درج ہے۔ محصوری کی حالت میں ہی اس کا انتقال ہوا۔

The Diary of a Dean اپنی نوعیت کا واحد روزنامچہ ہے جو کیمبرج کے پروفیسر William Ralph نے تحریر کیا اور ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد خود شائع کیا۔

روزنامچہ نویسی کا جواز: والٹر اسکاٹ

روزنامچہ کی اہمیت کا اندازہ سر Walter Scolt کے درج ذیل بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ چوالیس سال کی عمر میں جب اس نے کتاب زندگی کا پہلا روزنامچہ لکھا تو تاسف، دکھ اور درد کی سیاہ چادر نے اس کے وجود کا احاطہ کر لیا۔ وہ نہایت قلق سے لکھتا ہے۔

I have all my life regretted that I did not keep a regular Journal I have my self lost recollection of much that was interesting and I have deprived my family and the public of some curious information by not carrying this resolution into effect.

والٹر اسکاٹ کے اس قلق سے زیادہ دکھ ہمیں ان روزنامچوں کا ہے جو لکھے گئے لیکن محفوظ نہ کیے جا سکے یا ابھی تک کتب خانوں کی زینت ہیں۔ یہ روزنامچے ہمارا اجتماعی ورثہ ہیں اور اس ورثے سے کسی کو محروم نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہماری تاریخ، تہذیب، مذہب، ثقافت کی بے لوث، پرخلوص اور سچی علامتیں ہیں جن سے ہم تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے وجود کی افادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

روزنامچہ خود کلامی کی اعلیٰ ترین شکل:

روزنامچہ دراصل مجلس خلوت ہے، لیکن جلوت کے عیب سے خالی ہے یہ ایک آئینہ ہے جس میں روزنامچہ نگار کی شخصیت اس سے ہم کلام ہوتی ہے یہ خود کلامی کی اعلیٰ ترین شکل ہے جس کے ذریعے روزنامچے کے مباحث اور متن کے ذریعے بے شمار لوگ نہ صرف خود کلامی کی کیفیت کا صدیوں بعد بھی نظارہ کرتے ہیں بلکہ خود کلامی کا حصہ بن جاتے ہیں اور اس عہد میں اپنے آپ کو چلتا پھرتا محسوس کرتے ہیں جو تاریخ کے دریچوں میں ہمیشہ کے لیے کھو گیا ہے اور جس کی بازیافت کا صبح قیامت بھی امکان نہیں۔

دلچسپی جزئیات نگاری، نکتہ رسی، بے ساختگی، شگفتگی، چٹخارہ، برجستگی، بے لوثی، اور بے تکلفی روزنامچہ نگاری کے بنیادی خواص ہیں جس لمحے روزنامچہ نگار کو یہ اندازہ ہو کہ اس کی تحریر کوئی پڑھے گا اسی لمحے روزنامچہ کی تمام خصوصیات رخصت ہو جائیں گی۔ لیکن ایسی چند مثالیں موجود ہیں جب روزنامچہ نگار نے اشاعت کے ارادے سے روزنامچہ لکھا اور اس کے خصائص بھی برقرار رکھے۔ روزنامچے کا اصل حسن اخفاء ہے، یہ یقین کہ روزنامچے اور روزنامچہ نگار کے درمیان کوئی تیسرا شخص حائل نہیں حتیٰ کہ اس کے گھر کے قریب ترین لوگ بھی اس کے لیے بعید ترین بن جائیں تب ہی سچا روزنامچہ لکھا جاتا ہے۔ ایسا روزنامچہ لکھنا بہت مشکل ہے کہ جسے لکھنے والا اپنے قریبی لوگوں کو دکھانے میں تامل نہ کرے، واضح رہے کہ یہ نقطہ نظر صرف تہذیب جدید کے روزنامچوں کے لیے کفایت کرتا ہے اور تہذیب قدیم کے صرف ان روزنامچوں کے لیے جن کے لکھنے والے فسق و فجور کو جائز سمجھتے تھے اور خواہش نفس کے الہٰ کی پرستش کے بدترین شرک میں مبتلا تھے۔

مذہبی تہذیبوں میں ایسے روزنامچوں کی روایت ملتی ہے جہاں روزنامچہ نگار اخفاء پر اصرار نہیں کرتے، کیونکہ وہاں فرد کا ظاہر اور باطن ایک ہوتا ہے۔ آخرت کا احساس اس فرد کے ظاہر و باطن میں حیرت انگیز مطابقت پیدا کر دیتا ہے لیکن سترہویں صدی کے بعد لکھے گئے روزنامچوں کا بنیادی وصف اس کا اخفاء ہے۔ روزنامچہ نگار اپنی شریک زندگی کی بھی شرکت روزنامچہ پڑھنے میں گوارا نہیں کرتا، سترہویں صدی کے بعد نجی اور عوامی زندگی کے دو متوازی تصورات [Public and Private Life] نے ظاہر و باطن کی تفریق بہت بڑھا دی ہے۔ مختلف تہذیبوں میں روزنامچہ نگاری کے تقابلی مطالعے سے اس بیان کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ انگریزی میں ایولن [Evelyn] اور پیپس [Pepys] اور اردو میں مظہر علی سندیلوی کے روزنامچے اس کی عمدہ مثال ہیں۔

مغرب میں روزنامچہ نویسی کی تاریخ:

انگریزی روزنامچہ: Jounral: Diary

انگریزی میں روزنامچے کو Diary اور Journal بھی کہا جاتا ہے۔ ڈائری لاطینی لفظ dies سے اور journal فرانسیسی لفظ jour سے مشتق ہے۔ دونوں روزنامچے کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ڈائری نجی امور سے متعلق ہوتی ہے اور جرنل دفتری سرکاری دستاویزات کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن عملاً انگریزی میں ڈائری اور جرنل دونوں مفہومات کا احاطہ کرتے ہیں اور دونوں کی خصوصیات ایک دوسرے میں مدغم ہوجاتی ہیں۔ B.R. Haydon کا Journal اور James Boswell's کا London Jounral روزنامچوں کی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔[۷]

جرنل اور ڈائری میں فرق:

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جرنل سرکاری دستاویزات یا دفتری دستاویزات کے باقاعدہ اندراج کا نمونہ ہے اس موقف کی تردید کے لیے مشہور سائنس داں Charles Darwen کا جرنل کافی ہے۔ اس جرنل کا نام Journal of Researches into the natural History and Geology of the countries visited during the voyage of H.M S. Beagle. ہے۔ اس جرنل کا نام بہ ظاہر خشک سائنسی مضامین کی زنبیل کا تاثر قائم کرتا ہے لیکن Lawrene کے الفاظ میں:

It often includes delightful and amusing accounts of his own personal experiences during the voyage.

Pepy اور Evelyn کے روزنامچے Great Plauge اور Great Fire of London بن چکے ہیں۔

انگریزی میں روزنامچہ نویسی کی توانا روایت: اہم روزنامچے

انگریزی میں روزنامچہ نویسی کی روایت نہایت مستحکم ہے۔ [۱] انگریزی زبان کا پہلا روزنامچہ [۱۵۳۷۔۱۵۵۳] King Edward VI کا The Chronical of Edward VI ہے۔ [۲] دوسرا اہم روزنامچہ [۱۷۰۶ء سے ۱۶۲۰ء] John Evelyn کا The Diay of John Evely ہے۔ [۳] تیسرا اہم روزنامچہ [۱۶۹۰ء۔۱۶۲۱ء] Henry Teonge کا Diary of Henry Teonge ہے۔ [۴] چوتھا اہم روزنامچہ [۱۷۰۳۔۱۶۳۳ء] Samuel Pepy کا Diary of Samnel Pepys ہے۔ [۵] پانچواں اہم روزنامچہ [۱۷۲۶۔۱۶۵۹ء] Doctor Claver Morris کا The Diary of a West Country Physician ہے۔ [۶] چھٹا روزنامچہ ۱۷۵۴۔۱۷۰۷ء Henry Fiedding کا The Journal of a Voyage to Lisbon ہے۔ [۷] ساتواں روزنامچہ [۱۷۹۵۔۱۷۰۴ء] James Boswell کا The Journal of a Tour to the Hebrides ہے۔ [۸] آٹھواں روزنامچہ [۱۸۰۳۔۱۷۴۰ء] Wood

Diary of a Country Parson کا Forde ہے۔ [۹] نواں روزنامچہ [۱۸۴۰-۱۷۵۲ء] Fanny Burney کا The Diaries of Fanny Burney ہے۔ [۱۰] دسواں روزنامچہ اسکاٹ لینڈ کے معالج Mungo Park، The Travels of Mungo Park ہے۔

انگریزی روزنامچہ نگاروں کے پیشے:

انگریزی میں اس تسلسل وتواتر کے ساتھ روزنامچے لکھے گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے لکھنے والوں میں صرف بادشاہ، درباری، خوشامدی، ادیب، شاعر، مصور، منصف، مصنف، سپاہی، فوجی افسر، اداکار، مسخرے ہی نہیں بڑے بڑے سائنس داں، سیاستداں، پادری، مذہبی مفکرین، معالجین، مہم جو، کسان، لفنگے، جادوگر، گھریلوخواتین، عام لوگ، اعلیٰ سرکاری عہدیدار، سپہ سالار، فوجی، مفکر، امیر لوگ، ادنیٰ خاندان کے افراد، متوسط طبقے سے وابستہ لوگ، مختلف پیشوں کے افراد، معلم، مصنفین، مخنث، ہیجڑے، اچھال چھکا قسم کی عورتیں، عزت دار طوائفیں، کنچنیں، کرخنداری، بازاری ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ سائنس دانوں کے روزنامچوں میں [۱۸۲۹-۱۷۷۸ء] Humphsy Davy کی ڈائری Chemical and Philosphical Researches اہمیت کی حامل ہے۔ ڈیوی اپنی ایجاد Miner's Safety Lamp کی وجہ سے مشہور ہے۔ نائٹرس اوکسائیڈ کے موجد ڈیوی کا روزنامچہ ان دنوں اور ان لمحات کی نقشہ کشی کرتا ہے جب ایک تاریخ ساز ایجاد ظہور پذیر ہو رہی تھی۔ یہ لمحات کتنے عجیب اور کتنے قیمتی ہوں گے اس کا اندازہ اس روزنامچے کے مطالعے سے کیا جاسکتا ہے۔

Laughing Gas کے موجد کا روزنامچہ:

نائٹرس اوکسائیڈ کی اتفاقی حادثاتی ایجاد نے عصر حاضر میں بے ہوشی کی دواؤں Anaesthetic Medican کی صنعتی ترقی کو ممکن بنایا۔ روزنامچے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دوا سے مریض کا درد فوری ختم ہو جاتا تھا لہٰذا روتا، کراہتا، بلکتا، چیختا چلاتا مریض ہنسنے مسکرانے لگتا، اس کے ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ بکھر جاتی لہٰذا اسے Laughing gas کا نام دیا گیا۔ اٹھارہویں صدی میں نائٹرس اوکسائیڈ دانت کے شدید درد میں مبتلا مریضوں کے لیے مسکن دوا کا کام دیتا تھا، لوگ روتے ہوئے آتے اور ہنستے ہوئے جاتے تھے۔

انگریزی کا سب سے عمدہ روزنامچہ:

انگریزی زبان کا سب سے عمدہ روزنامچہ Samuel pepys کا ہے جو ایک عمدہ ناول سے بھی عمدہ ہے۔ اس روزنامچے میں اس کی شخصیت، افکار، احوال، لباس، رہن سہن، عادت اطوار کے ساتھ ساتھ اس کے گناہوں کی داستان اور اعتراف گناہ کے مرحلے بھی بیان ہوئے ہیں۔ صرف یہی نہیں اس عہد کے بڑے بڑے لوگوں کی خفیہ زندگی کے خوفناک گوشوں کی بھی نقاب کشائی کی گئی ہے اور روزنامچہ نگار نے اپنی ذات کے عیوب بھی بلاتردد بیان کر دیئے ہیں۔ زبان وبیان کے اعتبار سے بھی یہ شاہکار روزنامچہ ہے۔

روزنامچے کا مقصد: ورثاء کی کفالت

Heny,Fidlding کا روزنامچہ روزنامچوں کی تاریخ میں منفرد شے ہے اور واحد روزنامچہ ہے جس کے لکھنے کا مقصد موت کے بعد اس کی اشاعت تھی تاکہ اس کے ورثاء اس ذریعے سے مالی آسودگی حاصل کرسکیں۔ روزنامچے کے بین السطور سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اشاعت کی خاطر طول بیاں سے کام لے رہا ہے۔ یہ روزنامچہ اس عہد کے بحری اسفار اور اس سفر کو ممکن بنانے والے لوگوں کی اخلاقیات، نفسیات اور سفاکی کا بھرپور جائزہ پیش کرتا ہے۔ سمندر میں طوفانی ہواؤں اور طوفانی لہروں کے ساتھ ساتھ بے رحم سفاک کشتی رانوں کے ہاتھوں بیمار علیل fieldy پر کیا گزری بیمار کی راتیں کس اذیت سے دوچار ہوئیں ان تجربات کا حاصل فیلڈنگ کا تبصرہ ہے۔ Lisbon is the nastiest city on the world۔

دنیا کے اس بدترین شہر میں فیلڈنگ تبصرے کے صرف دو مہینے بعد زندگی کی بازی ہار گیا اور آخرت کے سفر پر روزانہ ہوگیا۔

Johny Evelyn اور Samuel Pepy کے روزنامچے جو سترہویں صدی کے مغرب کے اہم روزنامچوں میں شامل ہیں ان کی خاص بات یہ ہے کہ دونوں روزنامچہ نگار ہم عصر اور بہترین دوست تھے لیکن دونوں کے مزاج، عادات اطوار، قوت مشاہدہ، قوت تحریر میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

Evelyn ایک عالم فاضل امیر شخص تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہترین باپ اور وفادار شوہر بھی تھا۔ اس کی زندگی تقویٰ، پرہیزگاری کا نمونہ تھی۔ اس عہد کی غیر اخلاقی زندگی سے وہ بالکل الگ تھلگ تھا۔ یہ روزنامچہ براعظم یورپ میں سترہویں صدی میں طرز زندگی، طرز معاشرت پر پڑے ہوئے پردے اٹھا دیتا ہے۔

انگلستان میں مذہبی روزنامچہ نگاری کی ابتداء:

انگلستان میں مذہبی روزنامچوں کا آغاز روحانی زمرے سے ہوا Jhon Bcadls (وفات ۱۶۶۷ء) نے اپنے عقیدے کے مسیحیوں کو تلقین کی وہ اپنے روحانی تجربات کا ریکارڈ رکھا کریں۔ Bcadla نے اپنے پیغام کی تشریح ایک کتاب میں کی یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی یہ ذاتی ڈائری نہیں بلکہ Calvinish مسلک والوں کے لیے مذہبی طرز عمل کا ہدایت نامہ ہے اس ہدایت نامے میں ساری باتیں مذہبی نوعیت کی ہیں لیکن ان کے اندارجات سے غیر مذہبی معاملات سامنے آسکتے ہیں مثلاً ایک ہدایت یہ بھی ہے۔

''خدا نے تمہاری دعاؤں پر جو کچھ کیا ہو ان کو سپرد قلم کیا جائے''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی لبادے میں ذاتی نوعیت کی بہت سی باتیں احاطہ تحریر میں آسکتی تھیں اور واقعتاً آئیں۔ آرتھر ونسن نے دراصل ایک خودنوشت لکھ ڈالی اور یہ غیر مذہبی امور کا ایک ریکارڈ ہے جس پر اخلاقی غلاف چڑھانے کی کوشش کی گئی۔[۸]

اردو کا پہلا روزنامچہ: فرمان سلیمانی ۱۸۸۲ء

اردو میں روزنامچوں کی تعداد اس قدر کم نہیں جیسا کہ تصور کیا گیا ہے اس کے باوجود یہ بتانا بہت

مشکل ہے کہ اردو کا پہلا روزنامچہ کس سن میں لکھا گیا۔ مشفق خواجہ مرحوم نے لکھنو کے سید حسن لطافت کا روزنامچہ ''فرمان سلیمانی'' مرتب کیا تھا اس روزنامچے کا سال کتابت ۱۸۸۲ء ہے۔ حسن لطافت ریاست اودھ کے بارہ شاہزادوں کے استاد رہے یہ روزنامچہ شاہزادہ مرزا سلیمان قدر کے دربار سے متعلق ہے۔ جو واجد علی شاہ کے سوتیلے بھائی تھے یعنی ایک شہنشاہ کے بیٹے اور دوسرے شہنشاہ کے سوتیلے بھائی۔[۹] اس لحاظ سے اردو کا قدیم ترین روزنامچہ فرمان سلیمانی ہے۔ جسے مشفق خواجہ نے حواشی اور مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے لیکن یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ یہ روزنامچہ عنقریب شائع ہوگا۔ روزنامچے کے مقدمہ میں خواجہ صاحب نے اردو میں روزنامچہ نویسی کی روایت پر روشنی نہیں ڈالی نہ اس روزنامچے کا دوسرے روزنامچوں سے تقابل کیا ہے۔ یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ مشفق خواجہ جیسے محقق نے مقدمے میں اردو میں روزنامچے کی روایت پر کیوں نہ لکھا۔ یہ سوال بھی اٹھایا جاسکتا ہے کہ خواجہ صاحب نے فرمان سلیمانی کے مقدمے میں اس کا دوسرے روزنامچوں سے تقابلی مطالعہ کیوں پیش کیا نہیں۔ راقم کے خیال میں دنیا کا سب سے سہل ترین کام سوال کرنا اور اعتراض وارد کرنا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب اردو روزنامچے پر مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اسی لیے خواجہ صاحب نے اردو روزنامچہ کی تاریخ کے موضوع پر خامہ فرسائی سے گریز کیا ہے۔ افسوس کہ ہم اب اس کتاب سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئے اور سینکڑوں روزنامچوں کی تاریخ سے بھی جن سے صرف خواجہ صاحب واقف تھے۔ مجھے یاد ہے کہ خواجہ صاحب نے بعض قلمی روزنامچوں اور رجسٹروں کا ذکر کیا تھا جو سترہویں صدی کے اوائل کے تھے۔ ان میں سے کچھ روزنامچے سالم، سیل زدہ، نامکمل، کٹے پھٹے، اوراق کے ساتھ، قلمی، قلمی نسخوں کی نامکمل نقول پر مشتمل تھے۔ اردو کے قدیم رسائل واخبارات میں شائع ہونے والوں روزنامچوں کی عکسی نقول بھی خواجہ صاحب کے ذخیرے میں محفوظ تھیں۔ خواجہ صاحب کا طریقہ تحقیق یہ نہیں تھا کہ جو کچھ مل گیا اسے فوراً اپنے نام سے شائع کر دیا جائے وہ ریزہ ریزہ جمع کرتے تھے پھر خاکہ بناتے اس خاکے میں رنگ بھرتے اور جب اس رنگ سے وہ مطمئن ہوتے تو تحریر کا مرحلہ آجاتا۔ جب تک اطمینان نہ ہوتا وہ قلم نہ اٹھاتے۔ افسوس کہ وہ روزنامچے ہماری دسترس میں نہیں رہے۔ اردو زبان اب نادر روزنامچوں کے تعارف سے محروم رہ گئی ہے۔ مشفق خواجہ نے راقم الحروف کو قدیم صوفیا، مشائخ، علماء کے عربی، فارسی اور اردو کے قلمی روزنامچوں کے بارے میں بعض حیران کن تفصیلات سنائی تھیں جو کسی مناسب موقع پر پیش کی جائیں گی۔ واقعات اظفری فارسی کا ہندوستانی روزنامچہ ہے جو ۱۸۱۵ میں لکھا گیا جب روزنامچہ نگار شہزادے نے دہلی سے مدراس کا سفر کیا اور اس سفر کے حالات تحریر کیے۔ سلطان ٹیپو کی جانب سے بیرون ملک سفیر خواجہ عبدالقدیر کا فارسی روزنامچہ بھی اہمیت کا حامل ہے جس میں ترکی اور روس سے روابط کی تفصیلات درج ہیں۔

اٹھارہ سو ستاون: جنگ آزادی کے روزنامچے:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حوالے سے بے شمار روزنامچے لکھے گئے جن میں اہم ترین روز

نامچہ جنگ آزادی کے غدار اور بہادر شاہ ظفر کے معالج حکیم احسن اللہ خاں کا ہے جنرل بخت خان کے مشوروں تجاویز اور حکمت عملی سے بہادر شاہ ظفر کو غافل رکھنے اور بخت خان سے ایک خاص فاصلے پر رکھنے کا کام انگریزوں نے حکیم احسن اللہ خان کے سپرد کیا تھا، جنھیں اس غداری کا صلہ ۲۰۰ روپے ماہانہ پینشن اور تنہائی کی مستقل زندگی کی صورت میں دیا گیا۔[۹] یہ روزنامچہ فارسی میں لکھا گیا تھا اس کا اصل متن گمشدہ ہے لیکن اس کا انگریزی ترجمہ محفوظ رہ گیا چنی لال کا روزنامچہ بھی اہمیت کا حامل ہے دہلی کے اس بنیے کی دکان سے مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے محل میں ادھار سامان طلب کیا جاتا تھا اسی عہد کے مبارک شاہ کوتوال کا روزنامچہ بھی معروف ہے خواجہ معین الدین حسن کا روزنامچہ ''احسن الاخبار'' میں شائع ہوتا تھا بعدازاں خواجہ احمد فاروقی نے اسے ''حدنگ غدر'' کے نام سے شائع کر دیا تھا۔عبداللطیف کا ۱۸۷۵ء کا تاریخی روزنامچہ مرتبہ خلیق احمد نظامی بھی اہمیت کا حامل ہے۔

راشد الخیری، خواجہ عبدالحئی، اور ''سیاحت ہند'' والے عبدالرحمان امرتسری کے روزنامچے بھی معروف ہیں۔اختر انصاری کا روزنامچہ ایک طالب علم کی ڈائری بہت مقبول ہوا۔

عطیہ فیضی کا روزنامچہ: زمانہ تحصیل: خاندان فیضی کے اردو روزنامچے

عطیہ فیضی جن دنوں یورپ میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں تہذیب نسواں کے لیے باقاعدگی سے روزنامچہ تحریر کرتی تھیں ایام طالب علمی کا یہ روزنامچہ ''زمانہ تحصیل'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ان کی بہن کا روزنامچہ بھی شائع ہوا ہے لیکن ہمیں مل نہیں سکا۔[۱۰] عطیہ فیضی کا خاندان جسے ''بھائی میاں کی آپ بیتی'' سے شہرت ملی فی الحقیقت یہ آپ بیتی اردو کی پہلی آپ بیتی تھی جو ۱۸۶۷ء میں لکھی گئی یہ آپ بیتی بھائی میاں طیب جی کے سفر لندن کی روداد پر مشتمل ہے۔بدرالدین طیب جی کا روزنامچہ بھی اہم ہے لیکن غیر مطبوعہ.....عطیہ فیضی کے خاندان میں روزنامچہ نگاری کی روایت نہایت مستحکم تھی ان کے خاندان کے تمام بزرگ اور خواتین بڑے بڑے رجسٹروں میں ٹوٹی پھوٹی اردو میں روزنامچے نہایت پابندی سے لکھتے تھے یہ تمام روزنامچے عطیہ فیضی کے نوادرات میں آج بھی محفوظ ہیں۔ان روزنامچوں سے اس عہد کے بے شمار معاملات واقعات پر صحیح روشنی پڑ سکتی ہے۔

اشاعت کے منتظر روزنامچے:

حسن نظامی اپنے سفرناموں کو بھی روزنامچے قرار دیتے ہیں اپنے سفر نامہ ہند[۱۹۰۷ء] کو انھوں نے روزنامچہ لکھا ہے منادی میں ان کے روزنامچہ شائع ہوتے رہے ''دہلی کا آخری سانس'' کے نام سے بھی ان کا روزنامچہ موجود ہے۔''بہادر شاہ ظفر'' کا روزنامچہ خواجہ صاحب نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا حکیم محمد سعید کے کئی روزنامچے شائع ہو چکے ہیں۔شورش کاشمیری کا روزنامچہ ''یورپ میں چار ہفتے'' بھی معروف ہے۔ملا واحدی، ایوب دہلوی، خواجہ شفیع دہلوی، سبزۂ بیگانہ کے مصنف اور اشرف صبوحی کے روزنامچے اشاعت کے منتظر ہیں۔

خوف فساد خلق، کتابیں، روزنامچے

خوف فساد خلق کے باعث بے شمار روزنامچے ضائع کر دیے گئے یا ورثاء نے انھیں جلا دیا ایسے روزنامچوں کی ایک فہرست مشفق خواجہ کے پاس محفوظ تھی۔ خواجہ صاحب کے پاس ایسی کتابیں بھی محفوظ تھیں جن کے مالکان نے ان کتابوں کو مدتوں تک اپنی تجوریوں میں محفوظ رکھا، اپنے گھر والوں کو ان کتابوں کی زیارت سے محروم رکھا کہ ان کا متن اخلاقیات کے منافی تھا مرنے سے قبل اپنے اعمال نامے کے سیاہ باب خواجہ صاحب کے سپرد کر دیئے گئے۔ خواجہ صاحب کے ذخیرہ نوادرات میں ایسے سیاہ باب بہت ہوں گے۔ مرحوم جلیل قدوائی صاحب نے ایک فحش دیوان خواجہ صاحب کے سپرد کرتے ہوئے کہا تھا کہ عمر بھر اسے اپنی اہلیہ اور اپنے بچوں سے چھپاتا رہا یہ نہیں چاہتا کہ انتقال ہو تو میرے ترکے سے یہ دیوان برآمد ہو، میرے بچے میرے بارے میں کیا سوچیں گے کہ ان کا باپ کس مزاج کا آدمی تھا۔ تحقیق کے لیے یہ کتابیں جمع کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن بچوں کو یہ بات کیسے سمجھاؤں گا۔

روزنامچے: بیاض: کشکول: یادداشتیں

کیا روزنامچوں اور بیاض، کشکول یا یادداشتہا میں کوئی مماثلت تلاش کی جاسکتی ہے؟ اقبال کی Stray reflaction مولوی شفیع کی یادداشتہائی مولوی شفیع، یادداشتہائی مجتبیٰ مینوی، کشکول مفتی شفیع، کشکول حکیم محمود احمد برکاتی کو روزنامچوں کا جزو سمجھا جاسکتا ہے کیا یہ جزوی روزنامچہ کی کوئی شکل ہے؟ یہ بھی تحقیق کا ایک موضوع ہے کیو ں کہ یہ یادداشتیں بھی روزانہ کے مطالعے کے دوران آنے والے اہم واقعات، حوالوں، مطالعات کی زنبیل بن جاتے ہیں لیکن بہر حال روزنامچہ سے ان کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ لیکن ایک معروف جامعہ میں اس موضوع پر تحقیق جاری ہے۔ دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اردو میں روزنامچوں کے اس مختصر بیان سے ڈاکٹر صبیحہ انور کے اس مفروضے کی نفی ہو جاتی ہے کہ روزنامچے کو لوگ ''مدفاضل'' سمجھتے ہیں لہٰذا اردو میں روزنامچوں کا ذخیرہ اس قدر قلیل ہے کہ اس کے بارے میں لکھنے کی کچھ گنجائش نہیں[۱۱] حقیقت یہ ہے کہ اردو میں روزنامچوں کا ذخیرہ بے حد وسیع ہے صرف تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس جانب توجہ نہیں دی گئی۔

افسانوی روزنامچوں کی صنف:

مغرب میں روزنامچہ مقبول ترین صنف ہے، لہٰذا افسانہ نگاروں نے اس جام سفال میں افسانے کی صہبا استعمال کی اور افسانوی روزنامچے کی صنف وجود میں آئی، ہندوستان میں قاضی عبدالغفار کی کتاب ''مجنوں کی ڈائری'' اسی مغربی صنف کی نقالی تھی۔ انگریزی میں اس صنف میں Deniel Defoe کی کتاب A journal of the plague year اور Grossmiths کی Diary of a Nobody بہت معروف ہیں۔ Robinson Crusoe کے بعض حصے افسانوی روزنامچہ کی صنف نو کے تتبع میں لکھے گئے ہیں۔

بوسنیا: سرایو کی محصور لڑکی کا روزنامچہ: مقبول ترین روزنامچہ

عصر حاضر میں Dean Inge's کا روزنامچہ Diary of a Dean معروف ہے۔ سوتیلانا، ہٹلر

کے روزنامچے بھی مشہور تھے۔ گزشتہ چند برسوں تک سرایو کی خوں ریز وادیوں میں ڈیڑھ سال تک تہہ خانے میں رضا کارانہ قید میں رہنے والی ایک کم عمر لڑکی کے روزنامچے نے عالمی شہرت حاصل کی جو آنسوؤں، خون کے قطروں، لہو کی بوندوں، دکھ درد، غم کے آمیختے سے لکھا گیا تھا۔ یہ روزنامچہ چند دنوں میں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوا۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی روزنامچہ اس طرح پسند نہیں کیا گیا۔

خواجہ عبدالوحید کے روزنامچے کی اہمیت:

خواجہ عبدالوحید کے روزنامچے کا اردو روزنامچہ نگاری کی تاریخ میں کیا مقام و مرتبہ ہے؟ یہ اہم سوال ہے لیکن سر دست اس کا جواب مشکل ہے۔ کیونکہ ابھی تک اردو روزنامچے کی تاریخ تحقیق کے مراحل سے نہیں گزری ہے۔ لیکن اردو انگریزی کے دستیاب روزنامچوں سے اگر خواجہ صاحب کے روزنامچے کا موازنہ کیا جائے تو اس کے نتائج کو کس طرح مرتب کیا جائے گا؟ ایک سرسری جائزے سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ خواجہ عبدالوحید کا روزنامچہ حسن نظامی کی جزئیات نگاری، لطافت اور مظہر علی سندیلوی کی برجستگی نہیں رکھتا نہ ہی وہ انگریزی کے روزنامچہ نویسوں کی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس روزنامچے کی سب سے اہم بات اس کا سادہ سپاٹ انداز بیان ہے جس میں جذبات، رنگینی بیان، زیب داستان کے لیے افسانہ نویسی سے احتراز واضح طور پر محسوس ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مورخ پیش آنے والے واقعات سانحات کو دو جمع دو کی طرح جمع کر رہا ہے اس روزنامچے پر روزنامچہ کے بجائے تاریخ نویسی کا گمان ہوتا ہے۔ روزنامچہ نگار کی شخصیت ایک عالم، حلیم، مودب، نفیس، شائستہ، شگفتہ صاحب قال اور صاحب حال ہستی کی ہے لہٰذا ان کی تحریر میں سمندر کا ٹھہراؤ اور کہساروں کا جلال نمایاں نظر آتا ہے۔ اکثر مقامات پر روزنامچہ نگار کا قلم مورخ کے مشاہدات کا ترجمان بن جاتا ہے جو جذبات کی سطح سے اٹھ کر واقعات نگاری کو مرکزی اہمیت دیتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ روزنامچہ برعظیم پاک و ہند کے کئی برسوں کی سچی تاریخ کا آئینہ بن جاتا ہے۔ روزنامچہ نگار کے ظاہر و باطن میں کوئی تضاد نہیں ہے لہٰذا انھوں نے اس روزنامچے کی اشاعت میں دلچسپی بھی ظاہر کی اور اسے محفوظ بھی رکھا جب کہ اس روزنامچے کے بعض حصے ان کی ذاتی زندگی کے تلخ مقامات کی یاد دلاتے ہیں۔ انھیں بآسانی حذف کیا جا سکتا تھا۔

خواجہ صاحب کا روزنامچہ خشک دستاویز نہیں اس میں ان کے جذبات بھی ہیں، گھریلو مسائل بھی، اس عہد کے ہنگامے اور مسائل بھی، یہ ان کا ذاتی زائچہ بھی ہے لیکن کسی جگہ وہ مورخ کی سچائی اور غیر جانبداری کو مجروح نہیں کرتے۔ اس روزنامچے سے انیسویں صدی کے اوائل کا لاہور ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور اس عہد کی سب سے اہم شخصیت علامہ اقبالؒ کی تصویر بھی ان تحریروں سے ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ خواجہ عبدالوحید کے روزنامچے کے محاسن یا نقائص ہمارا موضوع نہیں ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کسی اور موقع پر پیش کی جائے گی۔ [اس مضمون کی پہلی قسط میں ہم نے انگریزی اردو روزنامچوں کا جائزہ لیا ہے، دوسری قسط میں ہم عربی، فارسی، ہندی، ہسپانوی اور فرانسیسی روزنامچوں کی

روایت کا جائزہ لیں گے اور تیسری قسط میں ان کے تقابلی مطالعات پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح دنیا کی اہم زبانوں میں روزنامچوں کی تاریخ مرتب ہو جائے گی۔]

روزنامچے کی خصوصیات:

خواجہ عبدالوحید کا روزنامچہ اس عہد کی تاریخ، معاشرت، سیاست، مناقشات، قومی و تہذیبی زندگی، علمی و ادبی انجمنوں، علمی ادبی معرکوں، ذوق علمی، ہنگاموں، تحریکوں، شخصیات، حادثات، واقعات سانحات کا نادر مجموعہ ہے۔ لاہور کو سیاسیات ہند میں مرکزی مقام حاصل تھا۔ اس عہد کے بڑے بڑے علماء اور سیاست دان لاہور سے تعلق رکھتے تھے۔ علامہ اقبال مرحوم جیسے عبقری لاہور میں مقیم تھے اس لیے لاہور کو امت مسلمہ کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ خواجہ صاحب کا روزنامچہ اس عہد کے لاہور کی نقشہ کشی کرتا ہے۔ یہ روزنامچہ ہمیں بتایا ہے کہ اس عہد میں ہندوستان کی معاشرت کیا تھی۔ لوگوں کے اخلاق کیسے تھے۔ سیاست دانوں کے طور اطوار کیا تھے؟ حکومت کے نظم و نسق کی کیا حالت تھی۔ لاہور کی معاشرتی زندگی کیسی تھی، اس عہد میں ماحولیات کا حال کیا تھا۔ لاہور کی مقامی تعطیلات کیا تھیں؟ بسنت کب مناتے تھے؟ میلے ٹھیلے پر کب چھٹی دی جاتی تھی؟ مگر اس روزنامچے کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں برعظیم پاک و ہند میں برپا روایت و جدیدیت کی کشمکش بلکہ معرکہ ایمان مادیت کے بارے میں اہم معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ روزنامچے کا یہ حصہ ہماری دلچسپی کا خصوصی موضوع ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم خصوصی دلچسپی کے اس موضوع پر گفتگو کریں۔ اس عہد کی سیاست معاشرت اور موسم کی جھلکیاں روزنامچے سے پیش کرتے ہیں۔ جب لاہور میں ژالہ باری ہوتی تھی کاغان کے راستے برف پوش وادیوں اور پھولوں میں گھرے ہوئے تھے لیکن اب صنعتی ترقی نے اس خوبصورت ماحول کو تباہ کر کے برف کی تہیں پگھلا دی ہیں۔

اس عہد کی معاشرت، سیاست اور ماحولیات کی جھلکیاں

شملہ: بچوں سے محبت کی روایت:

☆ شملہ میں مسلمان نوجوانوں کے مشاغل ذاتی عیش وعشرت کا عنصر بہت رکھتے ہیں۔ اسلامی یا قومی معاملات میں چنداں دلچسپی نہیں۔ ایک اچھی چیز بہت عام ہے اور وہ بچوں سے محبت ہے۔ قریباً ہر شخص نہ صرف اپنے بچوں سے بلکہ دوسروں کے بچوں سے بھی بہت محبت کرتا ہے۔ اِس میں ذرا افراط سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً بچوں کا منھ چومنا بہت عام ہے۔ یہ چیز اصولِ صحت کے کسی حد تک منافی ہے۔[۱۷]

اس زمانے کی معاشرت: قراقرم میں سامان سفر

☆ یہ مہم ۱۵-۱۹۱۴ء میں زیر سرکردگی Fillipo de Filippi آئی تھی۔ تمام کتاب بہت دلچسپ ہے۔ قراقرم کی بلندیوں سے گزرتے ہوئے اِن لوگوں کو بعض جگہ سامانِ تجارت برف میں دبا ہوا ملا جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ یا تو ایسے مسافروں کا معلوم ہوتا ہے جو راستے کی دشواریوں سے تنگ آ کر سامان ساتھ نہ لے جا سکے یا راستے میں تکان کی وجہ سے منزلِ مقصود تک پہنچ نہ سکے اور مر گئے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ اِن دشوار گزار بلندیوں پر لوگ چلتے

ہوئے سامان راستے میں ڈال دیتے ہیں اور پھر کسی سفر کے دوران اٹھالے جاتے ہیں۔ اِس عرصے میں کوئی راہرو اُس سامان کو نہیں چھیڑتا![۷۲]

خالدہ خانم: تقریر کے لیے پیسے دینے ہوں گے

☆ خالدہ خانم بلانے کے لیے دہلی سے لاہور اور واپسی کا دگنا اول درجے کا ریل کا کرایہ اور ۵۰۰ روپیہ فی لکچر دینا پڑے گا۔ اگر ہم اُن کو ایک لکچر کے لیے لاہور بلائیں تو مندرجۂ ذیل خرچ اٹھانا پڑے گا۔ کرایا ریل ۱۳۰ روپے۔ فیس لکچر ۵۰۰ روپے۔ دعوت ۱۵۰ روپے۔ متفرق اخراجات مثلاً طباعت اشتہارات، دعوت نامے ۴۰ روپے۔ جملہ ۸۲۰ روپے۔

لاہور کی معاشرت: کوئی رئیس مہمان نواز نہ بنا

☆ آج بہت کوشش کی کہ شریف مراکش کی رہایش کا انتظام لاہور کے کسی مسلمان رئیس کے مکان پر ہو جائے لیکن سخت ناکامی ہوئی۔ ناچار یہی فیصلہ ہوا کہ اُنھیں نیڈوز ہوٹل میں ٹھہرا دیا جائے۔

اُنھیں نیڈوز ہوٹل میں پہنچایا گیا جہاں ایک سیٹ تین کمروں کا گیارہ روپے روزانہ پر لیا گیا۔

لینڈو باڈی والی موٹر کار کرائے پر لی گئی (بحساب پندرہ روپے روزانہ)

قادیانیت: امیر مراکش اور محمد علی لاہوری کا مباحثہ

☆ آج ہز ہائی نس کے قیام لاہور کا آخری دن تھا۔ دوپہر کو احمدی (لاہوری) جماعت کا ایک وفد ہوٹل میں بغرضِ ملاقات آیا۔ وہ لوگ اپنے ہمراہ مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور کی چند کتب اور دو صد روپیہ نقد لائے تھے۔ ہز ہائی نس نے ایک کتاب یونہی اُٹھا کر کھولی تو جو صفحہ سامنے آیا، اُسی پر احمدی جماعت کے عقائد کی فہرست تھی جس میں عقیدہ نمبر ۹ یہ تھا کہ عیسٰے علیہ السلام وفات پا گئے ہیں۔ اِس عقیدے کو پڑھ کر ہز ہائی نس سخت ناراض ہوئے اور اُنھوں نے اِن حضرات کو اپنی چیزیں لے کر باہر نکل جانے کو کہا۔[۷۳]

شریف مراکش سے قادیانیوں کا مناظرہ:

☆ ہز ہائی نس کی مولوی محمد علی صاحب سے مذہبی بحث چھڑ گئی۔ آپ نے مرزائیوں کے عقائد پر بڑی عالمانہ تنقید کی اور رخصت ہونے کے وقت احمدی حضرات سے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر غلام محمد سے آخری بار جو گفتگو ہوئی وہ قابل غور ہے:

H.H. If you people are right, nothing will happen; but if you people are wrong something will happen to you within the next three months.

Dr. G. M. Please let me have your address so that I may write to you at the end of three months.

H. H. Perhaps you will not be able to write.[۷۴]

امیر مراکش اور احمدی جماعت کے مابین یہ مکالمہ ہمارے ذہنی افلاس کا ثبوت ہے۔ مراکش کے ولی عہد کی یہ گفتگو بتاتی ہے کہ مناظرانہ رنگ صرف ہندوستان پر غالب نہ تھا بلکہ عالم عرب وہاں کے اعلیٰ ترین طبقات حتی کہ مراکش کا شاہی خاندان بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس قسم کے دعوے اس عہد میں علم کی زبوں حالی کا اظہار کرتے ہیں۔

کوئٹہ کا زلزلہ ۱۹۳۵ء:

☆ ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ میں زلزلہ آیا، خواجہ صاحب انجمن خدام الدین کی طرف سے کوئٹہ خدمت کے لیے روانہ ہوئے، اس وقت ہند کے مسلمانوں کی جانب سے زلزلہ زدگان کی مدد کے لیے کیا اقدامات کیے گئے، نجی و سرکاری سطح پر کوئٹہ سے تمام لوگوں کو منتقل کرنے اور آرام پہنچانے کے کیا انتظامات کیے گئے؟ روزنامچہ اس پر روشنی ڈالتا ہے۔

☆ لاہور سے باوجود کوشش کے کوئی مسلمان ڈاکٹر ایسا نہ ملا جو ہمارے ساتھ رضا کارانہ طور پر کوئٹہ جاتا۔ یہ چیز نہ صرف قابلِ افسوس ہے بلکہ شرم ناک بھی ہے۔ میڈیکل کے طلباء آئے تھے۔

☆ صبح جب ہم سبی سٹیشن پر کھڑے تھے تو لاہور سے میڈیکل کالج کے طلبہ کی سپیشل ٹرین آ گئی۔ مسٹر مظہر الحق (ڈاکٹر عبدالحق کے بھتیجے) اور مسٹر نجم الثاقب ملے۔

☆ ہندو رضا کار کافی تعداد میں موجود بتائے جاتے ہیں لیکن مسلم رضا کار کوئی نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق تھا، میں نے بہت کوشش کی کہ یہاں رہ جاؤں لیکن میں یہاں پہنچا ہی اتنی دیر سے ہوں کہ مارشل لا جاری ہو چکا ہے اور سرکاری طبی امداد ضرورت سے زیادہ آ چکی ہے۔ پناہ گزینوں کا بیشتر حصہ جا چکا ہے۔

☆ کوئٹہ سے لاہور تک قریباً تمام ریلوے سٹیشنوں پر پناہ گزینوں کے لیے کھانے پینے کا اعلیٰ پیمانے پر انتظام تھا۔ ہر جگہ اپنے اپنے علاقوں کے لوگوں نے پلیٹ فارموں پر کیمپ لگائے ہوئے تھے اور شب و روز امداد بہم پہنچائی جاتی تھی۔ بہاولپور ریاست کی حدود کے اندر جس قدر سٹیشن ہیں، اُن پر بھی قابلِ تعریف انتظام تھا اور نواب صاحب خود ڈیرہ نواب کے سٹیشن پر پناہ گزینوں کی خدمت میں مصروف دیکھے جاتے تھے۔

جدیدیت پسندوں کے دعوے:

لاہور برِعظیم کا مرکز تھا جہاں اقبال مرحوم جیسے فلسفی تھے جو مغربی تہذیب و فکر سے بخوبی واقف تھے اور شاعری کے عصا سے مغرب کا زبردست مقابلہ کر رہے تھے۔

غلبہ مغرب کے باعث برِعظیم میں بے شمار جدیدیت پسند مفکرین کرامت جونپوری، سرسید، عبداللطیف خان، خدا بخش، امیر علی، چراغ علی، حالی وغیرہ منظر عام پر آ چکے تھے اور اسلام کے علوم اور ماخذات دین میں دراڑیں ڈال چکے تھے مثلاً اس عہد کے جدیدیت پسندوں کا دعویٰ کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ [word of God] اور کائنات خدا کا کام [work of God] دو قرآن ہیں ایک قرآن تیس پاروں میں [Holy Book] بند ہے۔ دوسرا قرآن کتاب فطرت ہے [Book of Nature]، علم کا مطلب سائنس [Science] اور عمل کا

مطلب ٹیکنالوجی [Technology] ہے۔علوم کی قدیم اسلامی تقسیم، علوم نقلیہ [Real Knowledge] اور علوم عقلیہ [Rational Knowledge] ختم ہوچکی ہے۔سائنس [Science] اور مذہب [Religion] میں کوئی فرق نہیں، سائنس داں [Scients] اور پیغمبر [Prophet] کے کام میں کوئی فرق نہیں، ایک مظاہر و آثار کائنات کے ذریعے خالق کائنات کا ادراک کرتا ہے، اور طبیعات کے ذریعے مابعد الطبیعیاتی حقائق تک پہنچتا ہے۔دوسرا تعقلی وجدان [Rational Intution] اور روحانی وجدان [Spritual Intution] کے ذریعے خالق باری کا براہ راست مشاہدہ کرتا ہے، یعنی نبی مابعد الطبیعیات کے ذریعے مابعد الطبیعیات کے حقائق تک پہنچتا ہے۔دوسرے لفظوں میں سائنس دان پیغمبر سے افضل ہے جو طبیعات سے مابعد الطبیعیات کی حقیقت جان لیتا ہے۔پیغمبر تو مابعد الطبیعیات کے سہارے ہی مابعد الطبیعیات کو پہچان سکتا ہے۔[نعوذ باللہ] دونوں کے اہداف، مقاصد، منازل میں کوئی فرق نہیں صرف طریقہ کار کا فرق ہے لیکن دونوں کے طریقہ کار کے نتائج یکساں ہیں یعنی حقیقت مطلقہ کی تلاش اور ادراک مغربی غلبے کے بعد نئی تقسیم علوم قبول کرنا ضروری ہے۔

سائنس داں عالم نبی سب برابر ہیں:

سائنس دان اور علماء برابر ہیں بلکہ اصل علماء تو سائنس دان ہیں جو مظاہر فطرت میں ڈوب کر فطرت کو تسخیر بھی کرتے ہیں اور بے نقاب بھی۔اصل عبادت مظاہر فطرت کی بخیہ گری ہے۔وہ شخص عالم ہی نہیں جو کچھ ایجاد نہ کر سکے اور انسانیت کی فلاح و بہبود میں ناکام رہے کیونکہ ایجادات تسخیر کائنات اور مادی فوائد کے بغیر فلاح کا کوئی تصور قابل قبول نہیں ہوسکتا۔علوم نقلیہ کا دور جا چکا اگر انھیں برقرار رکھنا ہے تب بھی ان کی تشکیل جدید اور از سر نو تشریح ضروری ہے۔عہد حاضر کا سائنٹفک انسان اسلام کی متعین کردہ قدیم تقسیم علوم کو قبول نہیں کرسکتا کیونکہ اس کا ذہن تجربیت اور حواس پر انحصار کرتا ہے لہٰذا سائنس اور سوشل سائنسز کو علوم کی بنیاد سمجھا جائے یعنی علوم کا ماخذ [Source of Knowledge] ذات خداوندی، وحی الٰہی، رسالت مآب کے بجائے اب صرف اور صرف [Human Rational and Human Mind] رہ گیا ہے کیونکہ سائنس اور سوشل سائنس انسان کی دریافت ہے۔اصل علم یہی ہے جس علم کے ساتھ ٹیکنالوجی نہ ہو اور تجربیت نہ ہو، جس کی سائنسی بنیادوں پر تصدیق و تردید ممکن نہ ہو وہ علم علم نہیں جہل ہے۔

جدید انسان کے لیے جدید زبان ضروری ہے:

اس عہد کا انسان پچھلے عہد سے مختلف ہے۔اس کے سانچے، ڈھانچے، فکر، نظر، جذبات، احساسات، خیالات، محسوسات، قدیم انسان سے یکسر مختلف ہیں لہٰذا اب قدیم علماء کی کتابیں ناکارہ ہیں، ان کو جدید پیرہن میں پیش کرنا ضروری ہے، مثلاً قدیم علماء فقہاء دین کو حقوق العباد اور حقوق اللہ کے خانوں میں تقسیم کیا ہے۔یہ تقسیم جدید ذہن قبول نہیں کرسکتا لہٰذا اسے جدید ذہن کے مطابق پیش کیا جائے۔جیسے ضابطہ ایمانیات، قانون عبادات، قانون معاشرت کیونکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی اصطلاحات میں اللہ اور عباد کے الفاظ آتے ہیں۔جدید ذہن نہ اللہ کو تسلیم کرتا ہے نہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ سمجھتا ہے لہٰذا جدید

ذہن کے لیے اسالیب، محاورہ، لغت، زبان، بیان، طرز سب بدل دیئے جائیں، قرآن میں کہا گیا کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ یہ بات نئے اسلوب میں پیش کی جائے کیونکہ جدید ذہن اس غیر سائنسی منطق کو تسلیم نہیں کرے گا۔ قرآن میں آسمان کا ذکر بار بار آتا ہے۔ یہ سائنسی لحاظ سے درست نہیں ہے۔ آسمان تو کوئی چیز نہیں لہٰذا اس اسلوب کو بدل کر کچھ اور الفاظ میں پیش کیا جائے۔ اس طرز عمل کو Reform، اصلاح، تجدید، تعمیر نو، تشریح نو، تعبیر نو کے خوبصورت ملحدانہ نام دیے گئے تا کہ دین کو جدیدیت کے نام پر متجدد دین کے حوالے کر دیا جائے۔ جدیدیت کی اس لہر کا لاہور کی علمی و ادبی و تحقیقی فضاء پر خاص اثر تھا، جس کی ایک جھلک ہمیں ان موضوعات میں نظر آتی ہے جو خواجہ عبدالوحید کے روزنامچے کے مطابق اس عہد میں لاہور کے افق پر روشن تھے اور مختلف سطحوں پر مباحثے کی صورت پیدا کر رہے تھے۔ ان موضوعات کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ احکام قرآن پر حکومت کے بغیر عمل ممکن نہیں علماء جو کچھ احکامات بتاتے ہیں اس پر عمل کے لیے حکومت ضروری ہے ورنہ عمل ممکن نہیں۔ [دوسرے لفظوں میں جب تک حکومت نہ ملے مسلمان بے عمل رہ سکتے ہیں]

۲۔ اسلامی سوسائٹی جب تک عورتوں کو اپنی زندگی کا مالک نہ بنائے انھیں عشق و عاشقی میں نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ کسی کے دام محبت میں گرفتار ہو کر وہ عورت نئی دنیا تعمیر نہیں کر سکتی لہٰذا عورت کے لیے فراق ہجر میں تڑپنے اور گھٹ کر مر جانے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ [یعنی تہذیب مغرب کے نتیجے میں عورت اگر آزاد ہوگی تو عشق و عاشقی کے لیے آزاد ہوگی، معاشرے کا اصل مسئلہ عورت کی آزادانہ محبت ہے]

۳۔ اس عہد میں جدیدیت کا عالم یہ تھا کہ علماء عجیب و غریب موضوعات پر خطاب فرماتے تھے، مثلاً مولانا غلام مرشد کا موضوع ''دین اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ قانون امن ہے''۔

۴۔ مولانا احمد علی لاہوری نے اس موضوع پر درس قرآن دیا کہ ''کس طرح مسلمانوں نے ترقی کے اصول ترک کیے اور ناکامی اٹھائی اور کیوں کر اہل مغرب نے انھیں اختیار کیا اور صفحہ ہستی پر غلبہ پالیا [درس قرآن کا یہ موضوع مسدس حالی کے ان مصرعوں کی نثر ہے جس میں حالی کہتے ہیں۔

شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے — وہ لے جا کے سب اہل مغرب نے جوڑے،
مداراب حفظ علم پر ہے شرف کا — کہ باقی ہے ترکہ یہی اک سلف کی
نہیں اب تلک اصلا خبر ہم کو یہ بھی — کہ ہے کون مردار کتیّا ترقی

حالی اسی مسدس میں مسلمانوں کی ماضی میں ترقی کے اسباب کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

لبرٹی میں جو آج فائق ہیں سب سے — بتائیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے
ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا — فلاطوں کو زندہ پھر کر دکھایا

ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا
پڑی خاک ایتھنز میں جاں یہیں سے ہوا زندہ پھر نام یوناں یہیں سے

[دوسرے لفظوں میں ماضی میں مسلمانوں کو غلبہ یونانی علوم وسائنس کے احیاء سے ملا تھا اور اب غلبہ مغربی علم وسائنس کو اختیار کرنے سے ملے گا نہ ماضی میں مسلمانوں کو اپنے علم کا کوئی ثمر ملا، نہ مستقبل میں مسلمانوں کو اپنے علم کا کوئی ثمر ملا نہ مستقبل میں کچھ ملنے کا امکان ہے جو کچھ ملے گا وہ غیروں سے ملے گا۔ اب یہ ثمر صرف مغرب سے ملے گا گویا مسلمانوں کے پاس نہ پہلے کچھ ان کا تھا نہ اب کچھ ان کا ہے، پہلے عروج یونان کے فلسفہ وسائنس سے ملا تھا اب مغرب کے فلسفے وسائنس سے ملے گا اور مغرب کی سائنسی ترقی تو اصلاً مسلمانوں سے مستعار لی گئی ہے۔ ان دلائل پر سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ:

آنکھ نرگس کی دہن غنچے کا حیرت میری
اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے؟]

۵۔ مغرب کی سائنسی ترقی اسلام کے باعث ممکن ہوئی۔ [یہ اس دور کا محبوب ترین موضوع تھا اور اس موضوع پر بے شمار مضامین لکھے گئے، مقالات پڑھے گئے، لیکن علامہ سلیمان ندویؒ کے سوا کسی نے اس سوال پر غور نہیں کیا کہ اسلام کی آمد سے ہزاروں سال پہلے چین، ہندوستان، ہڑپہ، موہنجوڈرو، یونان، مصر میں جو عظیم الشان سائنسی ترقی ہوئی وہ اسلام، قرآن اور رسالت مآبؐ کے بغیر کیسے ہوگئی؟]

۶۔ اسلام اور دنیوی ترقی۔

۷۔ ارتقاء اور اسلام۔

۸۔ گری ہوئی قوموں کو زندگی حاصل کرنے کے لیے کن اسباب کی ضرورت ہے۔ [سبب کا ذکر ہے مسبب الاسباب کا ذکر نہیں]

۹۔ عروج وزوال قوم کا فلسفہ

۱۰۔ شادی شدہ زندگی میں رومانس پیدا ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۱۱۔ مسلمان سائنس دان

۱۲۔ قرآن اور امن عالم

۱۳۔ قرآن حکیم اور انسانی ترقی کا معیار [مولانا احمد علی لاہوریؒ کا درس قرآن]

۱۴۔ قرآن اور امیر غریب کی جنگ، [مظہر علی اظہر کا درس قرآن]

۱۵۔ قرآن اور حقوق نسواں [مولانا غلام مرشد کا درس]

۱۶۔ کیا قرآن حکیم عورتوں سے خطاب کرتا ہے۔

۱۷۔ عورتوں کی صحبت ایک حد سے زیادہ بڑھ جانے پر مرد کو سوسائٹی کے لیے ناکارہ بنا دیتی ہے۔

۱۸۔ نبوت محمدی کی حقیقت کو بزرگان سلف بھی نہ سمجھ سکے۔

۱۹۔ اسلام اور ذہنی ترقی

۲۰۔ کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟

۲۱۔ اسلام کا اقتصادی نظام [۱۹۲۴ء میں خلافت اسلامیہ کا زوال ہوا اور ۱۹۳۵ء میں اس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے کہ کیا ہمارا نظام اقتصادی بھی تھا گویا صرف نو سال میں لوگ اسلام کے اقتصادی نظام کو بھول گئے۔]

۲۲۔ Development of Science under the infllence of Islam

۲۳۔ Religion and the solution of Modern Problem

۲۴۔ مفکرین اسلام

۲۵۔ تاج محل

26- THE SCIENTIFIC THEORIES OF RELIGION AND REVELATION.

27- THE POETRY OF HASRAT MOHANI.

28- THE BAHAI RELIGION.

29- REFORM MOVEMENTS IN THE MUSLIM WORLD.

۳۰۔ اسلام میں فکر سیاسی کی تاریخ

۳۱۔ مسلمان سائنس دان

۳۲۔ اسلام کی اولین صورت کو قائم رکھتے ہوئے اس زمانے میں دینوی ترقی بھی کی جاسکتی ہے [کسی نے یہ موضوع منتخب نہیں کیا کہ اسلام کی صورت بگاڑ کر دین میں تحریفات کر کے دین کو ترک کر کے ۱۹۲۴ء تک مسلمانوں نے کتنی ترقی کر لی تھی۔]

۳۰۔ How Islam was lost to Islam

۳۱۔ عرب اور امریکہ کی تلاش

ان موضوعات میں مرکزی موضوع عورت کی آزادی، اسے اسلامی اقدار و روایات سے آزاد کرانا، ترقی، عروج، معاشی خوش حالی شامل تھا۔ ان موضوعات کا اصل محرک مغرب سے حد درجہ کی مرعوبیت تھی۔ یہ مرعوبیت ایک عامی سے لے کر فلسفی اور عالم تک چھائی ہوئی تھی۔ سرسید احمد خان جیسے مصلح لندن گئے اور اپنی رہائش گاہ کی خادمہ کے اعتماد، کام اور حسن کلام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے خط میں لکھا کہ اس خاتون کا جو اخلاق و کردار ہے۔ ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان میں بھی اس درجے کی عورت نہ ملے گی۔ جدید سائنسی رصد

گاہوں، تجربہ گاہوں میں عورتوں کو آزادانہ کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ مغربی تہذیب پر ریجھ گئے۔ یہ حال سرسید کا تھا تو عام لوگ اس وباء سے کس طرح محفوظ رہتے۔ لہٰذا عورت کے حقوق، عورت کی آزادی، شادی کے لیے عورت کے آزادانہ ارادے، عشق و عاشقی کی آزادی، جیسے مباحث لاہور کے حلقوں میں کثرت سے اٹھتے رہے۔ افسوس کے ان مباحث میں مغربی فکر و فلسفے کی تنقید و تائید سے متعلق مباحث شامل نہیں ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب، اس کی سائنس اور اس کی ٹیکنالوجی سے متاثر ہونے والے مغرب کے فکر و فلسفے سے بالکل اسی طرح غافل تھے جس طرح عربی مدارس کے فاضلین جب لاہور کا یہ حال تھا تو ہندوستان کے دیگر شہروں کی علمی مجالس کے مباحث و موضوعات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ خواجہ عبدالوحید کے ادارے اسلامک ریسرچ اکیڈیمی کے زیر اہتمام بھی مغربی فکر و فلسفے کی حقیقت پر کوئی مقالہ نہیں پڑھا گیا۔

اس روزنامچے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے لاہور کے مذہبی اور غیر مذہبی حلقے مغربی فکر و فلسفے، مغرب کی الٰہیات، مابعد الطبیعیات، کونیات، وجودیات سے واقف نہ تھے اور مغرب کے بڑھتے چڑھتے ہوئے ترقیاتی انقلاب سے بے پناہ متاثر تھے اور مغرب کی اسلام کاری کے لیے کوششوں میں مصروف تھے۔ صرف علامہ اقبال مرحوم واحد استثناء تھے جو تہذیب مغربی پر تیشہ زنی کر رہے تھے۔

مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا مظہر علی اظہر جیسے علماء بھی ان موضوعات پر درس قرآن دے رہے تھے جن سے مرعوبیت مغرب کا پہلو نکلتا ہے لیکن ان مباحث اور دروس میں ایک موضوع بھی ایسا نہیں ملتا جس سے معلوم ہوتا ہو کہ اس وقت کے اہل دین و اہل علم مغرب سے مرعوب نہ تھے۔ علماء کرام ایسے ایسے موضوعات اظہار کے لیے منتخب کر رہے تھے۔ جن مباحث کی اسلامی منہاج میں کوئی جگہ نہ تھی وہ ترقی کو ایک غیر جانبدار قدر [Value Nutral] کے طور پر برت رہے تھے اور ترقی ترقی کا گیت گا رہے تھے لیکن اس ترقی فروغ کی اصل سے قطعاً ناواقف تھے لہٰذا ایسے ایسے دعوے اور مکالمات ہو رہے تھے اور ان کو اسلامی تاریخ تہذیب سے ثابت کیا جا رہا تھا جن کا وجود اسلامی علمیات میں گوارا نہیں کیا جاسکتا تھا۔

جدیدیت کے زیر اثر لاہور کے علمی حلقوں میں اٹھنے والے مخصوص سوالات اور موضوعات کے باوجود علامہ اقبال مرحوم ان مباحث سے قطعاً متاثر نہ تھے، وہ اسلام میں قائم کردہ عورت کی فطری حدود کو بالکل درست سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں انھیں دل و دماغ کا ایسا یقین حاصل تھا جو بڑے بڑے متقین کو بھی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ ان مباحث سے اقبال مرحوم سخت دل برداشتہ تھے۔ وہ ہندوستان میں تعلیم یافتہ لوگوں کے زبانی معرکوں سے تنگ آ گئے تھے۔ خواجہ عبدالوحید کا روزنامچہ علامہ اقبالؒ کے خیالات سے ہمیں آگاہ کرتا ہے صحبت اقبال کا ثمر خواجہ وحید کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔ پڑھے لکھے جہلاء ان کے بارے میں اقبال مرحوم کہتے ہیں:

ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ہلاک کر دیا جائے: اقبال

حضرت علامہ نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق یہ کہا کہ: ''میرا مدّت العمر کا مطالعہ اور مشاہدہ مجھے یقین دلا چکا ہے کہ یہ لوگ بالکل بے کار ہیں۔ بالخصوص ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمان''۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر

کبھی کام آ سکتے ہیں تو غریب مزدوری پیشہ یا دکان دار مسلمان جن کے لیے اُن کے دل میں محبت اور احترام ہے اور جن سے مل کر اُنھیں حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے۔لیکن تعلیم یافتہ مسلمانوں کا گروہ مستحقِ التفات نہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ قرونِ متوسطہ کے ڈکٹیٹر بن جائیں تو وہ اِس گروہ کو ''ہلاک'' کر دیں۔

آپ نے فرمایا کہ اسلام کا مستقبل دنیا کے دوسرے مسلمانوں پر منحصر ہے نہ کہ ہندی مسلمانوں پر۔ [ص۴۰۲، اقبال مرحوم کے حضور] خواجہ عبدالوحید کے مطابق [جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں حضرت علامہ کی رائے اچھی نہیں تھی۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دوسرے موقع پر انھوں نے فرمایا تھا ''ہمارے تعلیم یافتہ بات سن کر یاد نہیں رکھ سکتے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب انھیں کوئی پیغام دے کر بھیجا جائے تو وہ کسی پیغام کو من و عن نہیں پہنچاتے بلکہ اس میں کچھ نہ کچھ کمی یا بیشی کر دیتے ہیں۔'' اس کے بعد آپ نے فرمایا: ''میں نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی کو جب بھی کہیں پیغام دے کر بھیجا اس نے اس میں سے یا تو کچھ حذف کر دیا، یا کچھ اپنی طرف سے بڑھا دیا''۔حضرت علامہ نے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام ایک خط لکھا تھا ''مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ سخت پست فطرت ہے''۔ان الفاظ سے بھی جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں حضرت علامہ کی رائے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔[۴۱۸، اقبال مرحوم کے حضور]

جاپان میں اسلام ہفتوں میں پھیل سکتا ہے: اقبال

جاپان کا ذکر آیا تو آپ نے کہا کہ جاپان میں تبدیلیِ مذہب دنوں یا ہفتوں کا کام ہے نہ کہ یورپین ممالک کی طرح صدیوں کا۔اگر اسلام کا چرچا اُس ملک میں شروع ہو گیا تو چند ہفتوں میں تمام جاپانی قوم مسلمان ہو جائے گی۔اِس کی وجہ زیادہ تر سیاسی ہے۔جاپان کے لیے مسلمان ہو جانے میں یہ فائدہ ہو گا کہ روس کے خلاف اُسے چین اور ترکستان میں زبردست اسلامی قوت کی امداد حاصل ہو جائے گی۔[روزنامچہ، ص۱۶۰] یہی موضوع ایک اور جگہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

علامہ اقبال مرحوم مرحوم کا یہ خیال تھا کہ کسی بڑی آزاد قوم کا حلقہ بگوش اسلام ہو جانا دنیا میں اسلام کے لیے موجب احیاء ہو گا اس لیے ان کی یہ آرزو تھی کہ جاپانی یا جرمن ایسی قوم مسلمان ہو جائے۔ان کی یہ آرزو عین منشائے ایزدی کے مطابق تھی، اس لیے کہ قرآن میں کہہ دیا گیا ہے کہ اگر مسلمان اسلام کے لیے جدوجہد کرنے سے احتراز کریں گے تو اللہ تعالیٰ کوئی اور قوم کھڑی کر دے گا جو اللہ کی راہ میں مارنے اور مرنے سے گریز نہ کرے گی۔ہم عصر مسلمان ملکوں اور قوموں کے متعلق بھی حضرت علامہ کی رائے بالعموم اچھی نہ تھی، اس لیے کہ بیشتر ممالک یا تو مغربی استعمار کے پنجے میں پھنسے ہوئے تھے یا مغربی تمدن کے مقلد ہو چکے تھے۔ان کا یہ خیال بھی تھا کہ جب تک مسلمان قومیں مغربی اقوام کی غلامی سے آزاد نہ ہوں احیائے اسلام کا کام نہیں ہو سکتا۔

مرد دماغ سے تخلیقی کام لیتا ہے عورت رحم سے:

حضرت علامہ نے عورتوں کے متعلق متعدد باتیں کہیں۔مثلاً: I have no faith in women ۔ عورتیں اپنے مخصوص مشاغل (مثلاً خانہ داری) میں بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتیں۔[علامہ اقبال مرحوم کی

اس رائے سے اتفاق ناممکن ہے اس معاملے میں وہ مقامی معاشرتی رویوں سے بلند نہ ہوسکے] اس پر میں نے کہا کہ [خواجہ عبدالوحید] وہ شعبہ ہائے زندگی جن میں عورت کو اپنے کمالات دکھانے کی ہمیشہ آزادی رہی ہے، اُن میں بھی اُس نے مجتہدانہ شان پیدا نہ کی۔ چنانچہ موسیقی میں اگرچہ عورتیں ہمیشہ برسرِ عام آتی رہیں، فنِ موسیقی میں دسترس بہت کم عورتوں نے پائی۔ اِسی طرح باورچی کے کام میں ہمیشہ اور آج بھی مرد ہی پیش پیش رہے ،حالاں کہ یہ خالص نسوانی شغل تھا۔

پھر حضرت علامہ نے فرمایا کہ عورت کو دماغ کمزور ملا تھا، اس لیے کہ Creative Function اُس کے معاملے میں دماغ کی بجائے Womb سے تعلق رکھتا ہے۔ مرد دماغ سے تخلیق کا کام لیتا ہے اور عورت Womb سے۔ یہی وجہ ہے کہ جن عورتوں کا رحم اپنا طبعی کام کرتا ہے (یعنی جو بچے جنتی ہیں) وہ زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہوتی ہیں، بمقابلہ اُن کے جنھوں نے کبھی بچہ نہیں جنا۔ [روزنامچہ، ص۱۶۶]

اس سے مراد محض یہ تھی کہ قومی زندگی میں قیادت عورتوں کے بس کی چیز نہیں۔ ورنہ حیات اجتماعی میں عورتوں کے مقام کے متعلق ان کے خیالات عالیہ ان کے کلام میں بکثرت ملتے ہیں۔ انھوں نے جابجا عورت کے فرائض اصلیہ کی طرف توجہ دلائی ہے، اور ان فرائض میں ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت عورت کے ''فریضۂ امومت'' کی ہے۔ عورت کو اولاد سے محروم کردینے کو وہ تہذیب حاضرہ کے بدترین نتائج میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ نے اس تہذیب کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: مرد بے کار، زن تہی آغوش۔ [اقبال مرحوم کے حضور، ص۴۱۹]

اقبال مرحوم کا عشق ایمانی: طوائفیں:

اورنگ زیب عالمگیر نے، جو بڑا متشرع بادشاہ تھا، حکم دیا کہ ایک خاص مدت تک تمام طوائفیں نکاح کرلیں ورنہ کشتی میں بھر کر تمام کو دریا برد کردیا جائے۔ جب تعمیل حکم میں ایک دن باقی رہ گیا تو ایک طوائف جو شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے پاس آئی تھی، آخری سلام کے لیے حاضر ہوئی اور سارا ماجرا سنایا۔ شیخ نے کہا کہ تم حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد کرلو:

در کوئے نیک نامی مارا گزر نہ دادند
گر تو نمے پسندی تغییر کن قضا را

اور کل جب تمھیں دریا کی طرف لے چلیں تو با آواز بلند اس شعر کو پڑھتی جاؤ۔ ان طوائفوں نے اس کو یاد کرلیا اور جب روانہ ہوئیں تو یاس کی حالت میں نہایت خوش الحانی سے بڑے دردانگیز لہجے میں اس شعر کو پڑھنا شروع کردیا۔ جس جس نے سنا، دل تھام کر رہ گیا۔ جب بادشاہ کے کانوں میں آواز پہنچی تو بے قرار ہوگیا۔ ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ حکم دیا، سب کو چھوڑ دو۔

اس واقعے سے کلام حافظ کی تاثیر کا اندازہ فرمائیں۔ کیا ان معنوں میں حافظ کو ساحر کہنا کوئی بے جا بات تھی؟ یہ حافظ کا حسن کلام نہیں ہے بلکہ اقبال مرحوم اس کو حافظ کا فتح قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اقبال مرحوم کے

خیال میں اس شعر میں حافظ نے مسئلہ تقدیر کی غلط اور حیات کش تعبیر کی ہے۔ اقبال مرحوم فرماتے ہیں کہ:

''مسئلہ تقدیر کی ایسی غلط مگر دل آویز تعبیر سے حافظ کی شاعرانہ جادوگری نے ایک متشرع اور نیک نیت بادشاہ کو، جو آئین حقہ شرعیہ اسلامیہ کی حکومت قائم کرنے اور زانیات کا خاتمہ کر کے اسلامی سوسائٹی کے دامن کو بدنما داغ سے پاک کرنے میں کوشاں تھا، قلبی اعتبار سے اس قدر ناتواں کر دیا کہ اسے قوانین اسلامیہ کی تعمیل کرانے کی ہمت نہ رہی۔

عورتوں کے معاملے میں اقبال مرحوم راسخ العقیدہ خیالات رکھتے تھے اور اس کے مقام و مرتبے سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اقبال مرحوم کے عہد میں طوائفوں کو عروج حاصل تھا اس ضمن میں اقبال مرحوم کا تبصرہ نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ حافظ کی شاعری اور انحطاط پذیر مسلم معاشرے پر لطیف طنز کرتے ہیں۔

بداخلاقی کو طاقت سے مٹا دیا جائے: اقبال

آج حافظ حبیب اللہ صاحب کی معیت میں علامہ سر محمد اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باتوں باتوں میں جہاد پر گفتگو ہوگئی۔ میں نے پوچھا کہ جہاد دفاعی ہونا چاہیے یا جارحانہ۔ فرمانے لگے کہ عام طور پر دفاعی ہے لیکن بوقتِ ضرورت جارحانہ بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی قوم بداخلاقی میں اِس قدر بڑھ جائے کہ جس سے دنیا میں نسلِ انسانی بالعموم تباہ ہوسکتی ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ بزورِ شمشیر اُس قوم میں سے خرابی کو مٹانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ سلطان ٹیپو مرحوم نے مالابار کے غیر مسلم وحشی باشندوں کو کہا تھا کہ تم بجائے برہنہ پھرنے کے کپڑے پہنا کرو ورنہ میں بزورِ شمشیر تمھیں مسلمان بنا کر تمہیں کپڑے پہننے پر مجبور کروں گا۔ نیز آپ [علامہ اقبال] نے آج یہ بھی فرمایا کہ قرآن میں جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم مسلمانوں کو دیا گیا ہے تو اُس سے صاف ظاہر ہے کہ اشاعتِ حق کے پیچھے شمشیر کی حمایت ہونی چاہیے ورنہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ممکن ہے۔ اگر امر و نہی کے فرائض مسلمان ادا کرنا چاہتے ہیں تو اُن کے بازوؤں میں طاقت ہونا ضروری ہے۔ [روزنامچہ، ص ۲۹۳]

جذباتِ حسنہ کو مردہ کرنے والا آرٹ ممنوع ہے: اقبال

انسانی زندگی کو فائدہ پہنچنا چاہیے۔ اُن کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کو انسان کی زندگی کے لیے وقف ہونا چاہیے، اِس لیے ہر وہ آرٹ جو زندگی کے لیے مفید ہو، جائز ہے اور جو زندگی کے خلاف ہو، جو انسان کی ہمتوں کو پست اور جذباتِ حسنہ کو مردہ کرنے والا ہو، قابلِ نفرت ہے اور اُس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیے۔ [روزنامچہ، ص ۱۹۷]

عہد حاضر کی حکومت اخلاق کی حفاظت کو فرض نہیں سمجھتی: اقبال

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ حکومت کا سب سے بڑا فرض افراد کے اخلاق کی حفاظت ہے لیکن اِس سب سے بڑے فرض کو دنیائے جدید تسلیم ہی نہیں کرتی۔ حکومتیں محض سیاسی خیالات سے تعلق رکھتی ہیں۔ افراد کے

اخلاق کودرست کرنا اپنے فرائض میں داخل ہی نہیں سمجھتیں۔[روزنامچہ،ص۱۹۸]

ہندوؤں کی تباہی میں موسیقی کا حصہ ہے: اقبالؔ

پھر اسلام اور تہذیبِ حاضرہ کا ذکر ہوا۔فرمانے لگے کہ اسلام تہذیبِ حاضرہ کی تمام ضروری اوراصولی چیزوں کا دشمن ہے، اِس لیے مسلمانوں کواُسے تباہ کرنے کی کوششیں کرنا چاہیے نہ یہ کہ اِن چیزوں کو جزوِاسلام بنالیا جائے۔آپ نے یہ بھی کہا کہ اب دنیا اسلام کی طرف آرہی ہے، اِس لیے اگر آج تہذیبِ مغربی تباہ ہوجائے تو اسلام کا بول بالا ہوجائے گا۔اِس لیے مسلمانوں کو اِس آنے والے دور کے لیے تیار ہوجانا چاہیے۔جس وقت تہذیبِ جدید کا خاتمہ ہو،مسلمانوں کواسلام کا علم بلند کردینا چاہیے۔

آرٹ کے مضراثرات کے متعلق آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کے لیے مردہ بنادیتا ہے۔چنانچہ ہندوؤں کی تباہی میں موسیقی کا بہت حصہ رہا ہے۔[روزنامچہ،ص۱۹۸]

اسلام کی فلاح برطانیہ کی تباہی پر منحصر ہے: اقبالؔ

پرسوں رات علامہ سرمحمد اقبال مرحوم نے بڑی پرجوش باتیں کیں۔میں جب کبھی اُن سے ملتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ اُن کی باتیں لکھتا چلا جاؤں لیکن ایسا نہیں ہوسکتا اور بعد میں اکثر باتیں بھول جاتا ہوں۔اُس روز آپ نے فرمایا۔

Character is a Kind of energy. The more it is dissipated the weaker it becomes.

''جوجذبہ آج شاتمِ رسول کی سزا کے طور پر ہندو کے خلاف ظاہر ہورہا ہے، وہ عنقریب انگریزوں کی طرف رخ پھیرنے والا ہے''۔

حضرت علامہ کے خیال میں دنیائے اسلام کی فلاح سلطنتِ برطانیہ کی تباہی پر منحصر ہے۔[روزنامچہ،۲۱۴]

فقر سے انسان بے پناہ فائدہ اٹھاسکتا ہے: اقبالؔ

ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ایک قوم یا فرد کو حالات کی نامساعدت اور بخت کی نارسائی سے بھی فائدہ اُٹھانا چاہیے۔بے سروسامانی، افلاس اور فقر سے بھی انسان بے انتہا فوائد حاصل کرسکتا ہے۔ایک مفلس آدمی جس کے پاس چھن جانے کے لیے کچھ نہیں یا جسے کسی مال و متاع کی محبت اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی، حق وصداقت کی حمایت میں دلیری اور جرأت دکھاسکتا ہے۔[روزنامچہ،ص۱۷۸]

تعلیم سے نہ دنیا ملی نہ دین: اقبالؔ

تعلیم کا ذکر آیا تو فرمایا کہ مسلمانوں نے دنیا کمانے کے لیے دنیوی تعلیم حاصل کرنا چاہی لیکن نہ تو دنیا حاصل کرسکے اور نہ دین ہی سنبھال سکے۔یہی حال آج مسلم خواتین کا ہے جو دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں دین بھی کھورہی ہیں۔[روزنامچہ،ص۱۷۸]

ابلیس خارجی چیز ہے شیطان داخلی: اقبالؔ

حضرت علامہ کے پاس جتنا عرصہ ہم لوگ ٹھہرے بہت دلچسپ گفتگو ہوئی۔ زیادہ تر قادیانیوں کا ذکر رہا۔ آپ نے فرمایا کہ مرزا صاحب وحی والہام اور مہدی ومسیح میں تمیز نہیں کر سکے۔ شیطان کا ذکر آ گیا تو آپ نے توضیح فرمائی کہ ابلیس اور شیطان مختلف شخصیتیں ہیں۔ ابلیس بصیغہ واحد مذکور ہے اور شیطان کی جمع شیاطین بھی استعمال ہوئی ہے۔ ابلیس خارجی چیز ہے، شیطان داخلی۔ ابلیس Will کا نام ہے، شیطان قوت گمراہی کا۔ وغیرہ وغیرہ۔ [روزنامچہ، ص ۲۴۰]

بزگان سلف اور ہم نبوت محمدیؐ کی حقیقت نہ سمجھ سکے

کل رات کو علامہ سر اقبال مرحوم کی طرف گیا۔ وہاں پیر تاج دین صاحب بیرسٹر مع دو ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور بہت بیہودہ گفتگو میں مصروف تھے۔ مجھے اُن کے پاس بیٹھنا بہت ہی ناگوار معلوم ہوتا تھا۔

اُن کے جانے کے بعد حضرت علامہ سے باتیں شروع ہوئیں۔ اِس اثنا میں راجہ حسن اختر صاحب مع ایک ساتھی کے اور پھر چوہدری محمد حسین صاحب بھی تشریف لے آئے۔ رات کی گفتگو بڑی ہی دقیق، علمی و فلسفیانہ تھی۔ نبوت پر عمومی اور نبوت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام پر خصوصی بحث تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا پختہ خیال ہے کہ نبوت محمدیہ کی معنوی حیثیت کو انسان نہیں سمجھا۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ بزرگانِ سلف بھی اُس کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔

وہ خود مدّعی ہیں کہ اُن کو اِس کے DISCOVER کرنے کا موقع مل گیا ہے اور وہ تمہید القرآن (اُن کی مجوزہ کتاب) میں اِس پر بحث کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سترہ روز بعد قادیان تباہ ہو جائے گا:

علامہ اقبال مرحوم نے حسرت صاحب کو مشورہ دیا فوراً ''احسان'' میں موٹے موٹے الفاظ میں اعلان کر دیں کہ سترہ روز کے بعد قادیان تباہ ہو جائے گا۔ اور ہر روز اِس اعلان کو شائع کرتے رہیں۔ سترہ روز گزر جانے کے بعد جب اعتراض ہو تو کہہ دیا جائے کہ یوم قرآنی اصطلاح ہے نہ کہ چوبیس گھنٹے گزرنے کا وقفہ۔ [روزنامچہ، ص ۲۴۰]

یہی گفتگو خواجہ عبدالوحید صاحب نے نقوش اقبال مرحوم نمبر میں اس طرح درج کی ہے:

شیطان کا ذکر آ گیا تو آپ نے توضیح فرمائی کہ ابلیس اور شیطان شخصیتیں ہیں۔ [قرآن میں] ابلیس بصیغۂ واحد مذکور ہے اور شیطان کی جمع شیاطین بھی استعمال ہوتی ہے۔ ابلیس خارجی چیز ہے، شیطان داخلی۔ ابلیس Will کا نام ہے شیطان قوتِ گمراہی کا۔

[حضرت علامہ نے ازرہِ ظرافت چراغ حسن] حسرت صاحب کو مشورہ دیا کہ فوراً [روزنامہ] احسان میں موٹے موٹے الفاظ میں اعلان کر دیں کہ سترہ روز کے بعد قادیان تباہ ہو جائے گا اور ہر روز اس اعلان کو شائع کرتے ہیں۔ سترہ روز گزر جانے پر اعتراض ہو تو کہہ دیا جائے کہ ''یوم'' قرآنی اصطلاح ہے نہ کہ چوبیس گھنٹے کا وقفہ۔

[اقبال مرحوم کے حضور، ص ۴۰۵]

علامہ اقبال مرحوم اور خواجہ عبدالوحید نے قادیانیت کے خلاف اس بڑے پیمانے پر علمی و قلمی جہاد کیا جس کے خاموش اثرات عالم اسلام کے تمام دریار وامصار میں پھیل گئے۔ اس کا اندازہ اب لگانا مشکل ہے، قادیانیوں کے خلاف عالمی تحریک دراصل علماء، علامہ اقبال مرحوم اور وحیدالدین کے قلمی وعلمی جہاد کی اثر آفرینی کا اظہار ہے۔

روزنامچے میں علامہ اقبال کے ارشادات وملفوظات کی عبارتوں کا نقوش اقبال نمبر میں خواجہ صاحب کے مضمون ''اقبال کے حضور'' میں درج شدہ عبارتوں سے موازانہ کیا گیا تو بعض مقامات پر متن میں فرق محسوس کیا گیا۔ مرتب نے بعض مقامات قلم زد کردیے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مقامات مسودہ سے مٹ گئے ہوں۔

خواجہ عبدالوحید نے روزنامچے میں علامہ اقبال مرحوم کے ملفوظات کا جو خلاصہ پیش کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر لاہور میں صرف علامہ اقبال مرحوم مغربی فکر وفلسفے سے متعلق افکار اور اس کی ثقافت وسیاست و تہذیب سے پیدا ہونے والے مسائل پر مسلسل غور وفکر فرماتے تھے اور ان مشکلات کو حل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ خواجہ عبدالوحید صاحب علامہ اقبال مرحوم کے ہمسایہ تھے اور علامہ صاحب سے ان کے بچپن کے مراسم تھے، لیکن افسوس کہ علامہ اقبال مرحوم سے خواجہ صاحب کی اتنی قربت کے باوجود ہم تک روزنامچے کے ذریعے اقبال مرحوم کے جو ملفوظات پہنچے ہیں وہ بہت کم ہیں۔ اس کی وجہ خواجہ صاحب کی ذہنی ومعاشی پریشانیاں ہیں جس کا اظہار روزنامچے میں جگہ جگہ کیا گیا ہے۔ ان پریشانیوں کے باعث خواجہ صاحب علامہ اقبال سے کم کم ملتے تھے اور ملنے کے باوجود ذہنی پریشانی کے باعث اقبال مرحوم کے ملفوظات کو تحریر نہ کرسکتے تھے۔ خواجہ صاحب علامہ اقبال مرحوم سے اس قدر بے تکلف تھے کہ گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لیے اقبال مرحوم سے درخواست کو قبولیت بخشی۔ اس بے تکلفی کے باوجود خواجہ صاحب کے روزنامچے میں علامہ اقبال مرحوم سے جس پہلی ملاقات کا احوال درج ہے وہ ۱۹۳۴ء کی ہے جب کہ خواجہ صاحب بچپن سے علامہ اقبال مرحوم سے مستفید ہورہے تھے۔ ۱۹۳۴ء کے بعد بھی خواجہ صاحب کی علامہ سے بے شمار ملاقاتیں ہوئیں لیکن پریشان فکری کے باعث خواجہ صاحب ان علمی ملفوظات کو تحریر نہ کرسکے۔ اس کے باوجود اقبال مرحوم کے جو ارشادات روزنامچے میں محفوظ کیے گئے ہیں اہمیت کے حامل ہیں۔

اندھیری رات میں جگنو

ماہنامہ	سہ ماہی	ماہنامہ	سہ ماہی
بیداری	ایقاظ	فقہ اسلامی	السیرہ

خطبات اقبالؒ

خطبات کا ناقدانہ جائزہ

علامہ سید سلیمانؒ ندوی کی نظر میں

امالی ڈاکٹر غلام محمدؒ کے امالی

علامہ سید سلیمانؒ ندوی اور خطبات اقبال

علامہ ندوی کے افادات اور نقد

اسلام کی تشکیل نو کے لیے اقبال مرحوم نے یورپ کے فکر و فلسفے کے غیر جانبدارانہ و غیر جذباتی جائزے کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ یورپ جن نتائج تک پہنچا ہے وہ اسلام کے دینی فکر کی نظر ثانی اور تشکیل نو میں کہاں تک مدد دے سکتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر بھی سراسر غلط ہے۔ اول تو دینی فکر پر نظر ثانی کا امکان ہی خارج از بحث ہے لیکن ہلاکت آفرینی یہ ہے کہ اسلام پر نظر ثانی اور اسلام کی تشکیل کے لیے معاونت ایک ملحد اور کافرانہ فکر و فلسفے سے درآمد کی جا رہی ہے۔ اقبال مرحوم کا آخری خطبہ Is religion possible بہت مختصر ہے لیکن اسے پڑھ لیا جائے تو ان کی تمام فکری لغزشیں مغرب سے مرعوبیت عیاں ہو جاتی ہے۔ نکلسن کا دیباچہ مثنوی اسرار خودی میں اقبال کے افکار اقبال مرحوم کے الفاظ میں پڑھ لیے جائیں تو اقبال مرحوم اور مغرب کے مابین گہری فکری فلسفیانہ ہم آہنگی واضح ہو جاتی ہے۔ اسرار خودی کا دیباچہ جسے بعد میں خارج کر دیا گیا۔ خطبات کے جستہ جستہ مقامات دیکھ لیے جائیں تو اقبال مرحوم کی تمام غلطیوں کا طائرانہ جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

حضرت والا علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جن مقامات کی نشاندہی کی تھی۔ ان کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ [اقبال مرحوم کی تحریروں سے قابل اعتراض مقامات نکلسن کے دیباچے، خطبات اور اسرار خودی کے دیباچے اور چند مضامین سے منتخب کیے گئے تھے۔ سلیمان ندویؒ نے ڈاکٹر غلام محمد کو خطبات کے جن مقامات کے مطالعے کی ہدایت کی تھی اس کی تفصیل اور وہ تمام عبارتیں اس مضمون کی دوسری قسط میں پیش کی جائیں گی۔ فی الحال چند مقامات پیش کیے جا رہے ہیں، مرتب]

[1] The more genuine school of Sufism have, no doubt, done good work in shaping and directing the evolution of religious experience in Islam; but their latter day representatives, owing to their ignorance of the modern mind, have become absolutely incapable of receiving any fresh inspiration from modern thought and experience. They are perpetuating methods which were created for generations possessing a cultural outlook differing, in important respects, from our own.

[2] In these lectures I have tried to meet, even though partially, this urgent demand by attempting to reconstruct Muslim religious philosophy with due

regard to the philosophical tradition of Islam and the more recent developments in the various domains of human knowledge.

[3] The task before the modem Muslim is, therefore, immense. He has to rethink the whole system of Islam without completely breaking with the past……. The only course open to us is to approach modern knowledge with a respectful but independent attitude and to appreciate the teachings of Islam in the light of that knowledge, even though we may be led to differ from those who have gone before us.

[4] The truth is that the religious and the scientific processes, though involving different methods, are identical in their final aim. Both aim at reaching the most real…… In the domain of science we try to understand its meanings in reference to the external behaviour of reality; in the domain of religion we take it as representative of some kind of reality and try to discover its meanings in reference mainly to the inner nature of that reality. The scientific and the religious processes are in a sense parallel to each other. Both are really descriptions of the same world with this difference only that in the scientific process the ego's stand point is necessarily exclusive, whereas in the religious process the ego integrates its competing tendencies and develops a single inclusive attitude resulting in a kind of synthetic transfiguration of his experiences.

[5] The great point in. christianity is the search for an independent content for spiritual life which, according to the insight of its founder, could be elevated, not by the forces of a world external to the soul of man, but by the revelation of a new world within his soul. Islam fully agrees with this insight and supplements it by the further insight that the illumination of the new world thus revealed is not something foreign to the world of matter but permeates it through and through.

[6] The Absolute Ego, as we have seen, is the whole of Reality. He is not so

situated as to take a perspective view of an alien universe; consequently, the phases of His life are wholly determined from within.

[7] It is the lot of man to share in the deeper aspirations of the universe around him and to shape his own destiny as well as that of the universe, now by adjusting himself to its forces, now by putting the whole of his energy to mould its forces to his own ends and ,purposes. And in this process of progressive change God becomes a co-worker with him, provided man takes the initiative.

[8] The truth is that among the Muslim nations of. To-day, Turkey alone has shaken off its dogmatic slumber, and attained to self-consciousness. She alone has claimed her right of intellectual freedom; she alone has passed from the ideal to the real - a transition which entails keen intellectual and moral struggle. To her the growing complexities of a mobile and broadening life are sure to bring new situations suggesting new points of view, and necessitating fresh interpretations of principles which are only of an academic interest to a people who have never experienced the joy of spiritual expansion.

[9] Shari'at values (Ahkam) resulting from this application (e. g; rules relating to penalties for crimes) are in a sense specific to that people; and, since their observance is not an end in itself, they cannot be strictly enforced in the case of future generations.

[10] In the third period (of religious life) metaphysics is displaced by psychology and religious life develops the ambission to come into direct contact with the ultimate Reality.

[11] The interests of truth require that we must abandon our present attitude. I t does not matter in the least if the religious attitude is originally determined by some kind of physiological disorder. George Fox may be a neurotic; but who can deny his purifying power in England's religious life of his day? Muhammad, we are told, was a psychopath. Well, if a psychopath has the power to give a fresh direction to the course of human history, it is a point of the highest

psychological interest to search his original experience which has turned slaves into leaders of men, and has inspired the conduct and shaped the career of whole races of mankind. Judging from the various types of activity that emanated from the movement initiated by the Prophet of Islam, his spiritual tension and the kind of behaviour which issued from it, cannot be regarded as a response to a mere fantasy inside his brain. It is impossible to understand it except as a response to an objective situation generative of new enthusiasms, new organizations, new starting-points. If we look at the matter from the standpoint of anthropology it appears that a psychopath is an important factor in the economy of humanity's social organization. His way is not to classify facts and discover causes: he thinks in terms of life and movement with a view to create new patterns of behaviour for mankind. No doubt he has his pitfalls and illusions just as the scientist who relies on sense-experience has his pitfalls and illusions. A careful study of his method, however, shows that he is not less alert than the scientist in the matter of eliminating the alloy of illusion from his experience.

The question for us outsiders is to find out an effective method of inquiry into the nature and significance of this extraordinary experience.

[12] This is missing the whole point of higher religious life. Sexual self-restraint is only a preliminary stage in the ego's evolution. The ultimate purpose of religious life is to make this evolution move in a direction far more important to the destiny of the ego than the moral health of the social fabric which forms his present environment. The basic perception from which religious life moves forward is the present slender unity of the ego, his liability to dissolution, his amenability to reformation and the capacity for an ampler freedom to create new situations in known and unknown environments. In view of this fundamental perception higher religious life fixes its gaze on experiences symbolic of those subtle movements of Reality which seriously affect the

destiny of the ego as a possibly permanent element in the constitution of Reality.

[13] Whatever may be the psychological ground of the distinctions made in this passage it gives us at least some idea of a whole universe of inner experience as seen by a great reformer of Islamic Sufism.

[14] However, according to the teaching of the Qur'an the ego's re-emergence brings him a 'sharp sight' (50:22) whereby he clearly sees his self-built fate fastened round his neck.' Heaven and Hell are states, not localities. Their descriptions in the Qur'an are visual representations of an inner fact, i.e. character. Hell, in the words of the Qur'an, is 'God's kindled fire which mounts above the hearts-the painful realization of one's failure as a man. Heaven is the joy of triumph over the forces of disintegration. There is no such thing as eternal damnation in Islam. The word 'eternity' used in certain verses, relating to Hell, is explained by the Qur'an itself to mean only a period of time (78: 23). Time cannot be wholly irrelevant to the development of personality. Character tends to become permanent; its reshaping must require time. Hell, therefore, as conceived by the Qur'an, is not a pit of everlasting torture inflicted by a revengeful God; it is a corrective experience which may make a hardened ego once more sensitive to the living breeze of Divine Grace. Nor is Heaven a holiday. Life is one and continuous. Man marches always onward to receive ever fresh illuminations from an Infinite Reality which 'every moment appears in a new glory'. And the recipient of Divine illumination is not merely a passive recipient. Every act of a free ego creates a new situation, and thus offers further opportunities of creative unfolding.

[15] The state of Barzakh, therefore, does not seem to be merely a passive state of expectation; it is a state in which the ego catches a glimpse of fresh aspects of Reality, and prepares himself for adjustment to these aspects. It must be a state of great psychic unhingement, especially in the case of full-grown egos

who have naturally developed fixed modes of operation on a specific spatio-temporal order, and may mean dissolution to less fortunate ones. However, the ego must continue to struggle until he is able to gather himself up, and win his resurrection. The resurrection, therefore, is not an external event. It is the consummation of a life-process within the ego. Whether individual or universal it is nothing more than a kind of stock-taking of the ego's past achievements and his future possibilities. The Qur'an argues the phenomenon of reemergence of the ego on the analogy of his first emergence:

[16] Iqbal has drunk deep of European literature, his philosophy owes much to Nietzsche and Bergson, and his poetry often reminds us of Sheeley: yet he thinks and feels as a Moslem, and just for this reason his influence may be great. He is a religious enthusiast, inspired by the vision of a New Mecca, a world-wide, theocratic, Utopian state.

[17] The cry "Back to the Koran! Back to Mohammed! has been heard before, and the responses have hitherto been somewhat discouraging. But on this occasion it is allied with the revolutionary force of Western philosophy, which Iqbal hopes and believes will vitalise the movement and ensure its triumph. He sees that Hindu intellectualism and Islamic pantheism have destroyed the capacity for action, based on scientific observation and interpretation of phenomena, which distinguishes the Western peoples "and especially the English." Now, this capacity depends ultimately on the conviction that khudf (selfhood, individuality, personality) is real and is not merely an illusion of the mind. Iqbal, therefore, throws himself with all his might against idealistic philosophers and pseudo-mystical poets, the authors, in his opinion, of the decay prevailing in Islam, and argues that only by self-affirmation, self-expression, and self-development can the Moslems once more become strong and free.

[18] Other questions of a more fundamental character have been solved for me

by the author himself. At my request he drew up a statement of his philosophical views on the problems touched and suggested in the book. I will give it in his own words as nearly as possible.

[19] "The Philosophical, Basic of The Asrar-I Khudi. The test of reality, in his opinion, is all-inclusiveness; and since all finiteness is 'infected with relativity,' it follows that the latter is a mere illusion. To my mind, this inexplicable finite centre of experience is the fundamental fact of the universe. All life is individual; there is no such thing as universal life. God himself is an individual: He is the most unique individual. The universe, as Dr. McTaggart says, is an association of individuals; but we must add that the orderliness and adjustment which we find in this association is not eternally achieved and complete in itself.

[20] Thus the universe is not a completed act: it is still in the course of formation. There can be no complete truth about the universe, for the universe has not yet become 'whole.' The process of creation is still going on, and man too takes his share in it, inasmuch as he helps to bring order into at least a portion of, the chaos. The Koran indicates the possibility of other creators than God.

"Obviously, this view of man and the, universe is opposed to that of the English Neo-Hegelians as well as to all forms of pantheistic Sufism which regard absorption in a universal life or soul as the final aim and salvation of man. The moral and religious ideal of man is not self-negation but self-affirmation, and he attains to this ideal by becoming more and more individual, more and more unique. The Prophet said, 'Takhallaqu bi-akhldq Alla' 'Create in yourselves the attributes of, God.' Thus man becomes unique by becoming more and more like the most unique Individual. What then is life 1 It is individual: its highest form, so far, is the Ego (I(hudl) in which the individual becomes a self-contained exclusive centre. Physically as well as spiritually man is a self-contained centre,

but he is not yet a complete individual. The greater his distance from God, the less his individuality. He who comes nearest to God is the mpletest person. Not that he is finally absorbed in God. On the, contrary, he absorbs God into himself.

[21] Life is a forward assimilative movement. It removes all obstructions in its march by assimilating them. Its essence is the continual creation of desires and ideals, and for the purpose of its preservation and expansion it has invented or developed out of itself certain instruments, e.g. senses, Intellect, etc., which help it to assimilate obstructions. The greatest obstacle in the way of life is matter, Nature; yet Nature is not evil, since it enables the inner powers of life to unfold themselves.

"The Ego attains to freedom by the removal of all obstructions in its way. It is partly free, partly determined, and reaches fuller freedom by approaching the Individual who is most free God. In one word, life is an endavour for freedom.

[22] In man the centre of life becomes an Ego or Person. Personality is a state of tension and can continue only if that state is maintained. If the state of tension is not maintained, relaxation will ensue. Since personality, or the state of tension, is the most valuable achievement of man, he should see that he does not revert to a state of relaxation. That which tends to maintain the state of tension tends to make us immortal. Thus the idea of personality gives us a standard of value: it settles the problem of good and evil. That which fortifies personality is good, that which weakens it is bad. Art,1 religion, and ethics 2 must be judged from the standpoint of personality. My criticism of Plato 8 is directed against those philosophical systems which hold up death rather than life as their ideal systems which ignore the greatest obstruction to life, namely, matter, and teach us to run away from it instead of absorbing it.

[23] Trans1. 1. 673 foil. In a note on our Prophet's criticism of contemporary Arabian poetry" (1'he lYtiC Era, 1916, p. 251) Iqbal writes: The ultimate end of

all human activity is Life-glorious. powerful, exuberant. All human art must be subordinated to this final purpose. and the value of everything must be determined in reference to its life-yielding capacity. The highest art is that which awakens our dormant will-force and nerves us to face the trials of life manfully. All that brings drowsiness and makes us shut our eyes to Reality around, on the mastery of which alone Life depends, is a message decay and death here should be no opium-eating. In Art. The dogma of --- for the sake of Art IS a clever invention of decadence to cheat us out of life and power."

[24] Buddhism, Persian Sufism, and allied forms of ethics will not serve our purpose. But they are not wholly useless, because after periods of great activity we need opiates, narcotics, for some time. These forms of thought and action are like nights in the days of life. Thus, if our activity is directed towards the maintenance of a state of tension, the shock of death is not likely to affect it. After death there may be an interval of relaxation, as the Koran speaks of a barzakh, or intermediate state, which lasts until the Day of Resurrection. Only those Egos will survive this state of relaxation who have taken good care during the present life. Although life abhors repetition in its evolution, yet on Bergson's principles the resurrection of the body too, as Wildon Carr says, is quite possible. By breaking up time into moments we spatialise it and then find difficulty in getting over it. The true nature of time is reached when we look into our deeper self. 2 Real time is life itself, which can preserve itself by maintaining that particular state of tension (personality) which it has so far achieved. We are subject to time so long as we look upon time as something spatial. Specialised time is a fetter which life has forged for itself in order to assimilate the present environment. In reality we are timeless, and it is possible to realize our timelessness even in this life. This revelation, however, can be momentary only.

[25] THE EDUCATION OF THE EGO "The Ego is fortified by love ('ishq).

This word is used in a very wide sense and means the desire to assimilate, to absorb. Its highest form is the creation of values and ideals and the endeavour to realize them. Love individualizes the lover as well as the beloved. The effort to realize the most unique individuality individualises the seeker and implies the individuality of the sought, for nothing else would satisfy the nature of the seeker.

[26] "In another part of the poem 2 I have' hinted at the general principles of Moslem ethics and have tried to reveal their meaning in connexion with the idea of personality. The Ego in its movement towards uniqueness has to pass through three stages:

(a) Obedience to the Law.

(b) Self-control, which is the highest

form of self-consciousness or Ego-hood.1

(c) Divine vicegerency.2

"This (divine vicegerency, niyabat-i ildltt) is. the third and last stage of human development on earth. The nd'ib (vicegerent) is the vicegerent of God on earth. He is the completes. Ego, the goal of humanity, the acme of life both in mind and body; in him the discord of our mental life becomes a harmony. The highest power is united in him with the highest know ledge. In his life, thought and action, instinct and reason, become one. He is the last fruit of the tree of humanity, and all the trials of a painful evolution are justified because he is to come at the end. He is the real ruler of man kind; his kingdom is the kingdom of God on earth. Out of the richness of his nature he lavishes the wealth of life II on others, and brings them nearer and nearer to himself. The more we advance in evolution, the nearer we get to him. In approaching him we are raising our selves in the scale of life; The development of humanity both in mind and body is a condition precedent to his birth. For the present he is a mere ideal; but the evolution of humanity is tending towards the production of an

ideal race of more or less unique individuals who will become his fitting parents. Thus the Kingdom of God on earth means the democracy of more or less unique individuals, presided over by the most unique individual possible, I on this earth. Nietzsche had a glimpse of this ideal race, but his atheism and aristocratic prejudices marred his whole conception.

مثنوی اسرارِ خودی کا دیباچہ جو حذف کر دیا گیا:

مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتۂ خیال سے سری کرشن نے ''گیتا'' کی تفسیر کی، اسی نکتۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اُندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی، جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور اُن کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ اَن تھک مفسر تھے، اسلامی تخیّل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحدالدین کرمانی اور فخرالدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطّبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے جزو کل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخئیل کی مدد سے طے کر کے ''رگِ چراغ'' میں ''خونِ آفتاب'' کا اور ''شرارِ سنگ'' میں ''جلوۂ طور'' کا بلا واسطہ مشاہدہ کیا۔

مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا، مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انھوں نے دل کو اپنی آماج گاہ بنایا اور اُن کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔ علماء قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ اور حکماء میں واحد محمد نے اسلامی تخئیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔

مغربی اقوام اپنی قوتِ عمل کی وجہ سے تمام اقوامِ عالم میں ممتاز ہیں اور اسی وجہ سے اسرارِ زندگی کو سمجھنے کے لیے اُن کے ادبیات و تخیّلات اہلِ مشرق کے لیے بہترین رہنما ہیں۔ اگرچہ مغرب کے فلسفۂ جدید کی ابتدا ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی کے نظامِ وحدت الوجود سے ہوتی ہے، لیکن مغرب کی طبائع پر رنگِ عمل غالب تھا۔ مسئلہ وحدت الوجود کا یہ طلسم، جس کو ریاضیات کے طریقِ استدلال سے پختہ کیا گیا تھا، دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا۔

سب سے پہلے جرمنی میں انسانی انا کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا اور رفتہ رفتہ فلاسفۂ مغرب، بالخصوص حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت اس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہو گئے۔

نظامِ قدرت کے پُر اسرار بطن سے واقعات پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، مگر بیکن

سے پہلے کون جانتا تھا کہ یہ واقعاتِ حاضرہ، جن کو نظریات کے دل دادہ فلسفی اپنے تخیل کی بلندی سے بہ نگاہِ حقارت دیکھتے ہیں، اپنے اندر حقایق و معارف کا ایک گنجِ گرانمایہ پوشیدہ رکھتے ہیں، حق یہ ہے کہ انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں حس ''واقعات'' اور اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ''دماغ یافتہ'' فلسفیانہ نظام، جو واقعاتِ متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہوسکتا ہو، انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیاتِ عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ ان سے مستفید ہوکر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظرِ ثانی کریں۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ تمام جدیدیت پسند کرامت علی سے مشرقی اور اقبال مرحوم تک سب اسلام کی اصلاح کے درپے ہیں۔ ایک بھی ایسا نہیں جو مغرب کی اصلاح چاہتا ہو، تمام عیب نقائص اسلام میں ملتے ہیں، مغرب ہر عیب سے خالی ہے۔ یہ عجیب تضاد ہے۔ کوئی مغرب کو بدلنا نہیں چاہتا سب اسلام کو بدلنا چاہتے ہیں اور بدلنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ ان میں سے کچھ عربی نہیں جانتے، کچھ اسلام کو نہیں جانتے، کچھ مغرب کو نہیں جانتے، سب ایک آنکھ والے ہیں لیکن صرف اسلام کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام اور مغرب دو مختلف ادیان ہیں، مارما ڈیوک پکتھال تو مغرب کو تہذیب ہی نہیں مانتے وہ تو کہتے تھے کہ یہ بہیمیت ہے یہ کتوں اور بلیوں کی تہذیب ہے اسے تہذیب نہیں کہا جاسکتا۔ مسلمانوں کا اصل انحطاط اور ذلت کی آخری حد یہی ہے کہ انھیں اپنے عروج کے لیے اپنے آپ کو سنبھالا دینے کے لیے، سہارا کہاں سے ملے گا۔ اللہ سے اس کے رسول سے اپنے نظریہ حیات سے نہیں بلکہ یورپ کے اصولوں سے تجربیت سے، سائنس سے، عقلیت سے، معتزلہ سے، نطشے، برگساں کے سپرمین اور وجدان سے یہ پستی کی انتہا ہے۔ اسی لیے علماء نے خطبات اقبال مرحوم کی شدید مخالفت کی، کفر کے فتوے بھی دیے گئے لیکن ہم اقبال مرحوم کی اہمیت و افادیت کو سمجھتے تھے، علماء نے کہا کہ خطبات پر نقد معارف میں آنا چاہیے، اس ہیچ مداں نے صرف زبانی اتنا کہا کہ یہ لیکچر شائع نہ ہوتے تو اچھا ہوتا، اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ اقبال مرحوم کی شاعری نے اس ملت کو تازہ خون پہنچایا بلکہ اس ملت کے بچھڑے اور بچھڑے ہوئے قافلے کو کمک پہنچائی، جب شاعری پڑھتے ہیں تو ایک آتش فشاں ابلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ اقبال مرحوم کا دل دردمند ہے جو شعروں میں ملت کے زخموں کے لیے مرہم بن جاتا ہے۔ اقبال مرحوم کی شاعری اور نثر میں بڑا فرق ہے۔ ایک دل کا معاملہ ہے، دوسرا عقل کا۔ اسلامی تاریخ و تہذیب میں عقل کا مقام دل ہے جب وہ دل کے مقام سے خطاب کرتے ہیں تو ان کے دل سے نکلی ہوئی آواز ملت اسلامیہ کے دل کی آواز بن جاتی ہے لیکن یہی آواز جب مغرب سے متاثر ہوکر عقل کے ذریعے نثر میں آتی ہے تو ملت اسے مسترد کر دیتی ہے۔ علماء نے ان کی شاعری کے بڑے حصے کو قبول کرلیا کہ یہ ٹھیک تھا جو حصہ غلط تھا وہ غلط ہے لیکن نثر کو قدیم اور جدید طبقات نے مسترد کر دیا۔ البتہ مجھے نظر آتا ہے کہ

مستقبل میں مغرب فکر اقبال مرحوم اور خطبات کو اسلامی معاشروں کو جدید بنانے کے لیے مضبوط آلے کے طور پر استعمال کرے گا۔ نکلسن نے اپنے مقدمے میں بلا وجہ نہیں لکھا:

They involve a radical change in the Moslem mind and their real importance is not to be measured by the fact that such a change is unlikely to occur within a calculable time.

اقبال مرحوم نے اغنی دیس پادری رجب علی پادری میلکم کے تصور کے برعکس مولوی چراغ علی کے فلسفے سے DYNAMISM کی اصطلاح لے کر کائنات اور اشیاء میں ابدی سکون کی نفی کی اور یہ نفی اس حد تک وسیع ہوئی کہ انھیں کائنات مسلسل تخلیق کا عمل نظر آئی حتیٰ کہ خدا بھی تخلیق ہونے لگا، کائنات مسلسل تخلیقی میلان وسیلان سے بہرہ ور ہونے لگی اور ارتقاء در ارتقاء کی منزلیں طے کرنے لگی۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ خودی کی براقی و درا کی اور تخلیقیت کی شان نہ انبیاء کو معلوم تھی نہ صحائف آسمانی میں ان کا ذکر ہے نہ سلف کے علم میں تھی نہ خلف کو ان کا پتہ ہے۔ یہ اقبال مرحوم کے ذہن و دماغ کی خوبصورت اپج ہے، مگر یہ اپج اسلامی علوم کی نفی کرتی ہے، خدا خود تخلیق ہو رہا ہے اور کائنات بھی مسلسل تخلیق ہو رہی ہے۔ ایک ایسا تصور ہے جو مذاہب عالم کی پوری تاریخ میں کہیں نہیں ملتا، ان خود ساختہ تصورات کی بنیادیں جدید سائنس سے اقبال مرحوم کی والہانہ محبت میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ اب سائنس کے مفروضات کی بنیاد پر ذات خداوندی اور اس کی برپا کردہ کائنات کے بارے میں اس آزادانہ تبصرے کی جرأت اسلامی تاریخ میں اقبال مرحوم کے حصے میں آئی۔

اقبال مرحوم کے پاس ان موضوعات کے سلسلے میں اہم ترین حوالہ وائٹ ہیڈ کا ہے، اس کے فکر کا اقبال مرحوم پر بہت اثر تھا لیکن کائنات کے ضمن میں اقبال مرحوم نے جن آیات کو استعمال کیا ہے وہ محل نظر ہیں، ان آیات کا انطباق ان مباحث پر ممکن ہی نہیں۔ خودی، دعا، آزادی سے ہمکنار ہونا، اپنے تجربات سے خودی کی تشکیل جیسے مباحث تمام کے تمام مغربی فلسفے سے اقبال مرحوم نے مستعار لیے اور انھیں اپنے الفاظ میں اسلام کا پیرہن عطا کرنے کی کوشش کی۔

اقبال مرحوم اجتہاد مطلق کے موید تھے یعنی اس درجے کا اجتہاد جو ائمہ اربعہ کی سطح کا ہو یعنی مجتہد مخصوص فقہ کی سطح سے بلند ہو کر براہ راست قرآن وسنت سے استنباط کرے یہ خواہش بہت عمدہ ہے لیکن کیا اس درجے کا اجتہاد کرنے کے لیے اس درجے کی شخصیت، وہی تقویٰ، وہی للّٰہیت، وہی زہد ضروری نہیں ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اب اجتہاد مطلق کے لیے مجتہد مطلق کا مغربی فکر و فلسفے جدید سائنس اور یونانی فکر و فلسفے کو بخوبی جاننا ضروری ہے اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یونانی، جرمن، فرانسیسی، انگریزی زبانوں پر بھی عبور رکھتا ہو تاکہ کفر کی حقیقت اس کی اصل زبان میں پڑھ سکے۔ مجتہد کی یہ اضافی صفات عہد حاضر کے

لیے ضروری ہیں لیکن اجتہاد کی بنیادی صفات وہی رہیں گی جو امام نوویؒ، بیضادیؒ، غزالیؒ، بزودیؒ، شاطبیؒ اور صاحب تفسیر احمدیہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اگر ایسا کوئی مجتہد پیدا ہو جائے تو وہ ضرور اجتہاد کرے لیکن ترکی کے کمال مصطفیٰ اتاترک اور ترکی کی پارلیمنٹ جیسے کافرانہ ملحدانہ اداروں سے اجتہاد کی توقع کرنا اقبال مرحوم کی فاش غلطی تھی اقبال مرحوم نے نثر اور شاعری کے اشارات میں ان مجتہدین عصر پر لطیف طنز کیا ہے جو علوم نقلیہ میں رسوخ اور رسوخ فی الدین کے بغیر اجتہاد کے علمبردار بن گئے ہیں۔ لیکن ان کی مذمت کرتے ہوئے اقبال مرحوم خود اپنے مقام کا جائزہ نہیں لیتے کیا وہ ان مباحث کو برپا کرنے کے اہل تھے عربی زبان سے واقفیت کے بغیر اور علوم اسلامی میں رسوخ کے بغیر ایک ایسے منصب پر فائز ہونے کی کوشش جہاں سے وہ ملت اسلامیہ کی تشکیل نو کا فریضہ بھی سنبھال لیتے ہیں اور اجتہاد کا طریقہ کار بھی خود طے کر لیتے ہیں اقبال مرحوم کو اجتہاد کے اس فساد کا اندازہ تھا لہذا وہ اسرار خودی میں کہتے ہیں

نقش بر دل معنی توحید کُن　　چارہ کار خود از تقلید کُن
اجتہاد اندر زمان انحطاط　　معنی تقلید ضبط ملت است

ان اشعار میں اقبال مرحوم نے عہد حاضر میں تقلید کو اجتہاد پر فوقیت دینے کا عندیہ دیا ہے جب اقبال مرحوم کا عہد اجتہاد کے قابل نہ تھا تو آج کے عہد میں تو اجتہاد سے گریز اور تقلید پر اصرار بدرجہ اولیٰ افضل ہے یہ درست ہے کہ اقبال مرحوم کی تائید تقلید ایک عارضی طریقہ اور احتیاطی راستہ ہے اور وہ اجتہاد کے زبردست موید تھے۔ مگر کیا عصر حاضر اس احتیاط کا مکلّف نہیں ہے۔ اجتہاد کی ضرورت سے انکار نہیں لیکن شرائط اجتہاد پر اصرار ہے۔ اجتہاد کرنے کے لیے کم از کم مطلوبہ قابلیت تو پیدا کیجیے اس کے بغیر صرف تمنا کا قدم اجتہاد کا راستہ آسان نہیں کر سکتا۔ اجتہاد کی بحث میں اقبال مرحوم یہ نکتہ فراموش کرتے ہیں کہ اجتہاد تو نویں صدی ہجری تک کسی نہ کسی شکل میں ہو رہا تھا، لیکن اجتہاد کے دور میں ہی تاتاریوں نے مسلمانوں پر غلبہ کیسے حاصل کر لیا نہ تو وہ کوئی نظریہ حیات رکھتے تھے نہ ان میں وہ حرکت تغیر ارتقاء Dynamism تھا جو کسی تہذیب و تمدن کے غلبے کے لیے بنیاد کا کام کرتا ہے پھر یہی غلبہ اچانک ختم ہو جاتا ہے اور مسلمان دوبارہ غالب آ جاتے ہیں یہ تبدیلی کس اجتہادی قوت کے ذریعے پیدا ہوئی یہاں تو تبدیلی کا عمل صرف دعوت کے ذریعے وقوع پذیر ہوا ہے اگر مسلمان تاتاری غلبے سے اجتہاد کے بغیر نکل سکتے ہیں تو مغربی تہذیب کے غلبے سے نکلنے کے لیے صرف اور صرف اجتہاد پر زور دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ابن تیمیہؒ کی تحریک اجتہاد کی اہمیت اپنی جگہ اس تحریک سے تاتاریوں کی شکست اور مسلمانوں کے غلبے کا کیا جواز مہیا کیا جا سکتا ہے۔ ابن تیمیہؒ کے کس اجتہاد سے تاتاریوں کو شکست ہوئی اور کس اجتہاد نے مسلمانوں کو غلبہ دیا۔ قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کو حرکت و ترقی کا مظہر قرار دینا بڑی عجیب بات ہے یہ فکر تاریخ اسلام کے لیے اجنبی فکر ہے اقبال مرحوم تقلید کے خلاف اٹھنے والی وہابی بابی تحریکوں کو اسلام کے دور جدید میں زندگی کے نئے سرچشموں سے تشبیہہ دیتے ہیں لیکن ان سرچشموں نے عالم اسلام کی قسمت پر کیا اثر ڈالا۔ وہابی تحریک اجتہادی تحریک تھی؟ کیا یہ تحریک اجتہاد کے

زور پر پھیلی؟ کیا اس تحریک کی مقبولیت اجتہادی روح کے باعث ہوئی یا اس تحریک نے جبر کے ذرائع پر انحصار نہیں کیا؟ تاریخ کا اس رخ سے جائزہ لیا جائے تو چونکانے والے حقائق منظر عام پر آئیں گے۔

اس دور کی تاریخ فراموش نہیں کی جاسکتی خلافت عثمانیہ کے خلاف انگریزی استعمار نے آل سعود کو کس طرح استعمال کیا یہ کیسی اجتہادی حرکت تھی جو طاقت اور جبر کی بنیاد پر اپنا دائرہ وسیع کررہی تھی۔ اقبال مرحوم وہابی تحریک کے غلبہ کو اجتہاد کا غلبہ اور امت کے لیے نیک شگون تصور کرتے ہیں۔ یہ رویہ دراصل ان کی روحانیت کا نتیجہ ہے جو ملت اسلامیہ کا عروج چاہتی ہے خواہ یہ عروج جبراً ہو جبکہ عروج جبر سے کیسے آ سکتا ہے۔صرف اجتہاد کے جوش میں تحریکوں کی تعریف وتوصیف یک طرفہ نظریہ ہے جو اقبال مرحوم جیسے مفکر کے شایان نہیں ہے انتہا یہ ہے کہ وہ ترکی کی اصلاحات کو بھی اجتہاد کے احیاء کی نئی شکلیں قرار دیتے ہیں۔اور ان شکلوں کی بنیاد پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلامی ثقافت اپنی اصل میں حرکت پذیر ہے اور اس حرکت کے لیے قوت نمو اسے خارج سے نہیں داخل سے فراہم ہوتی ہے آج اقبال مرحوم زندہ ہوتے تو اپنے ان مفروضوں کی حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے، ان کی نظر سے کمال اتاترک کے کمالات نہیں گزرے جب وہ آسمان کی طرف مکے اٹھا کر اللہ تعالیٰ کو دکھاتا تھا اگر اسلام ایسے اجتہاد کے لیے آیا تھا تو پھر اسلام کی کیا ضرورت ہے؟ وہابی تحریک نے عصر حاضر کے تناظر میں کیا اجتہاد کیا ہے؟ ہم تو کم ازکم اس سے لاعلم ہیں۔ عالمی اختفال اسلامی کراچی میں منعقد ہوئی تھی، پوری دنیا سے تمام مکاتب فکر کے مسلم علماء فقہا تشریف لائے تھے، کئی روز تک ان سے تبادلہ خیال ہوتا رہا سب کا خیال یہی تھا کہ مغربی فکر وفلسفے اور جدید سائنس کو سمجھے بغیر اجتہاد الحاد کا راستہ کشادہ کرے گا، ہر دردمند عالم خواہ کسی مکتب فکر سے ہو، اپنے ملک کی صورت حال سے مایوس تھا اور ہمارے شاعر مشرق بابی، (وہابی) ترک، اجتہاد میں امیدوں کا جہاں آباد کررہے تھے۔

قدیم علماء نے اجتہاد کے لیے جو شرائط طے کیں وہ اقبال مرحوم کو عصر حاضر کے فرد میں نظر نہ آئیں تو انھوں نے اجتماعی اجتہاد اسمبلی کے ذریعے کرنے کا اجتہاد فرمایا، جب شرائط اجتہاد فرد میں نہیں پائی گئیں تو اسمبلی میں کیسے اکٹھے ہوسکتی ہیں، سو صفر اکٹھے ہوکر ایک کیسے بن سکتے ہیں، اسمبلیوں کے انتخابات کا تماشہ ہندوستان میں بہت دیکھا جاچکا یہ اسمبلیاں کیسے اجتہاد کرسکتی ہیں، اسمبلی کے انتخابات کی بنیاد مساوات کے نظریے پر ہے، تمام انسان برابر ہیں، ایک زمانہ تھا جب ہند میں صرف ٹیکس دینے والے ووٹ دے سکتے تھے، وہ زمانہ بھی ختم ہوگیا، ہم پاکستان کی اسمبلی کو اجتہاد کے قابل نہیں سمجھتے اس کے اراکین کا دینی علوم سے کیا تعلق ایک آدھ استثنیٰ چھوڑ دیجیے۔ اب علامہ اقبال مرحوم اور ایک بقال کا ووٹ برابر ہے اور دونوں یکساں طور پر جمہوری عمل کے ذریعے اسمبلی کے ممبر بن سکتے ہیں، اب بقال، حمال، حجام اور موچی اجتہاد کریں گے، اقبال مرحوم کا یہ نقطہ نظر ان کی سطحیت کو واضح کرتا ہے، اس سطحیت کا احساس انھیں آہستہ آہستہ ہوتا گیا کیونکہ شروع میں خطبات پر علی گڑھ میں بہت داد ملی اور ہندوستان کے پڑھے لکھے جو مغرب سے مرعوب تھے انھیں اقبال مرحوم کے ذریعے اسلام کی فصیل میں لقب لگانے کا زبردست طریقہ مل گیا تھا لیکن جب گرد بیٹھ

گئی تو حقیقت بھی کھل گئی۔ بعد میں اقبال مرحوم ہندوستان کے ان پڑھے لکھوں سے بہت متنفر ہوئے اور ان سے مکمل مایوس ہوگئے بلکہ کہتے تھے کہ اگر میں آمر ہوتا تو ان کو ہلاک کر دیتا۔

اقبال مرحوم مغرب کے Feminism سے شدید متاثر تھے ایک مضمون میں [انھوں نے لکھا تھا کہ تعدد ازواج اس عہد کے سیاسی اقتصادی ضرورتوں سے مشروط تھا اور فی زمانہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے جو علماء تعدد ازواج کی اجازت دیتے ہیں وہ امرائے قوم کو زنا کا شرعی بہانہ مہیا کرتے ہیں‘‘] یہ جسارت مغربی فکر و فلسفے کا نتیجہ اور علوم اسلامی سے عدم واقفیت کے باعث تھی لیکن آخر زمانے میں اقبال مرحوم نے مغرب کی فحاشی عریانی بے حیائی دیکھی تو مجھے لکھا تھا کہ اسلام کے تعدد ازواج کے اصول کی اصل حقیقت تو مجھ پر واضح ہوئی ہے اگر شارع علیہ السلام ہوتا تو چار کی تعداد میں مزید اضافہ کر دیتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ عقل اور اجتہاد جب اصول دین بن جائیں تو اسی قسم کی افراط وتفریط لازمی ہے پہلے دوسری کے بھی قائل نہ تھے اب پانچویں کے بھی قائل ہوگئے اسی لیے تقلید اجتہاد سے بہتر ہے اور اگر اجتہاد کرنا ہے تو ان تمام شرائط کا ہونا لازمی ہے جو علماء نے بیان کی ہیں۔ بعد میں اقبال مرحوم نے عورتوں کے حدود کار، حجاب، تقسیم کار پر وہی موقف اختیار کرلیا تھا جس پر اجماع امت ہے۔

فقہ اسلامی میں طلاق کے مسئلے کی تاریخی تحقیق سے بھی اقبال مرحوم گہری واقفت نہ رکھتے تھے لہذا انھوں نے وکالت کے پیشے میں جب طلاق کے مقدمات کثرت سے دیکھے تو اس ضمن میں فقہی احکامات سے متنفر ہوگئے احکام کی علت اور روح سمجھے بغیر محض چند واقعات وحادثات سے مضطرب ہوجانا دین کا مزاج نہیں ہے عورت طلاق لیتی ہے مرد طلاق دیتا ہے یہ فقہ کا اصول نہیں قرآن کا حکم ہے اقبال مرحوم کو اعتراض تھا کہ نکاح کے معاہدے میں دونوں فریقوں کو برابر کے حقوق حاصل نہیں طلاق دینا حق نہیں ایک ضرورت ہے اور ایسی ضرورت جو انتہائی ناگزیر حالات میں زیر عمل آتی ہے اقبال مرحوم حق اور ضرورت میں فرق نہیں کرسکے کیوں کہ اس باریک فرق کو سمجھنے کے لیے فقیہانہ نظر ضروری ہے ایک بار انھوں نے مجھ سے شکوہ کیا تھا کہ ہندوستانی معاشرے میں مسلمان لڑکیوں کو اپنی پسند کی شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے خصوصاً حنفی فقہ ولی کی شرط عائد کرتی ہے یہ قرآن کے نصوص کے خلاف ہے میں نے سوال کیا کہ اس سوال پر تو ہم بعد میں بات کریں گے کہ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کو ولی کے بغیر نکاح کی اجازت ہونی چاہیے یا نہیں پہلا سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے معاشرے میں لڑکوں کو اپنی پسند سے شادی کرنے کی اجازت ہے یا نہیں وہ چپ ہوگئے میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ کی شادیاں کیا آپ کی مرضی سے ہوئیں وہ غمگین ہوگئے میں نے عرض کیا جب اس عہد کا اتنا بڑا آدمی اپنی پسند سے شادی تو کیا طلاق بھی نہیں دے سکتا تو یہ کہنا کہ لڑکیوں کو پسند کی شادی کی اجازت نہ دینا ظلم ہے خلط مبحث ہے مسئلہ لڑکی یا لڑکے کی پسند ناپسند کا نہیں شادی انفرادی معاملہ نہیں ہے یہ ایک اجتماعی عمل ہے اس کے نتیجے میں صرف ایک لڑکا لڑکی بندھن میں نہیں بندھتے بلکہ ایک خاندان دوسرے

خاندان کا حصہ بنتا ہے ۔ رشتوں تعلقات کی سینکڑوں نئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں اگر لڑکی مرضی سے شادی کرے اور خاندان کی امان سے محروم ہو جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ لڑکا اس سے ہمیشہ عمدہ برتاؤ کرے گا پسند کی شادی کے جتنے بھی واقعات میرے علم میں ہیں ان میں اسی فیصد طلاق پر ختم ہوئے کیوں کہ لڑکی خاندان کی امان سے محروم ہوئی تو لڑکے کو اپنی مرضی چلانے کی آزادی مل گئی، اگر دونوں میں اختلاف ہوگیا تو لڑکی تنہا رہ گئی، ایسا بھی ہوا ہے کہ نہ لڑکی کے گھر والے راضی تھے نہ لڑکے کے گھر والے دونوں خاندان کی امان سے محروم ہوئے ۔حوادث کا شکار ہوئے، معاشی بدحالی میں مبتلا ہوئے یا معاشرتی طور پر تنہا ہوگئے اس مصیبت میں بعض جگہ دہری مصیبت یہ آئی کہ دونوں میں اختلافات ہوگئے، بچے برباد ہوئے، ان کا کوئی والی تھا نہ ولی، فقہاء دین کے احکامات باریک بینی سے اخذ کرتے ہیں عام آدمی ان کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا، اقبال مرحوم نے ایک فتوے پر اعتراض کیا کہ اگر لڑکی نیچے رہتی ہے اور ماں باپ گھر کے اوپر رہتے ہیں، لڑکا بیوی کو ملاقات سے منع کردے تو لڑکی پر تعمیل حکم واجب کیوں ہے؟ ایک قریبی عزیز کا واقعہ ہے کہ لڑکی کے والدین نہایت بدمزاج جھگڑالو قسم کے تھے لیکن بیمار بھی، لہٰذا داماد نے انھیں ساتھ تو رکھا لیکن لڑکی کو ممانعت کردی فتوے کی مصلحت فقیہہ سمجھ سکتا ہے عامی نہیں، اسلام میں رشتہ نکاح کو ہر حال میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔شوہر کی اطاعت کا حکم بلاوجہ نہیں دیا گیا ہے احکام اور فتاویٰ کی مصلحتیں باریک بین نگاہیں سمجھ سکتی ہیں۔فقہی احکام بہت گہری مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔جنھیں مغربی ذہن اور مستشرقین کی تحقیق نہیں سمجھ سکتی۔

جہاں تک پنجاب کے ان مقدمات کا تعلق ہے کہ خاوند ظالم ہے بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا خاندانی نظام ختم ہوگیا ہے معاشرت تباہ ہوگئی ہے یورپ کی طرح ہر شخص آزاد ہے جو چاہے کرتا پھرے ہمیں اپنی معاشرت اور اپنے خاندان کی اصلاح کی ضرورت ہے نہ کہ شریعت اور فقہ کی اصلاح کی جائے اصل معاملے تک پہنچے بغیر ہم فرع پر رک جاتے ہیں فقہ اسلامی پر اقبال مرحوم کی نظر بہت سطحی تھی۔

اقبال مرحوم کو پنجاب میں ارتداد کے ذریعے تنسیخ نکاح کے مقدمات کی یلغار کا سامنا کرنا پڑا بجائے اس کے کہ وہ پنجاب کی مقامی معاشرت، عادات رسوم ورواج پر غور کرتے تاکہ اتنے بڑے پیمانے پر تنسیخ نکاح کے مقدمات کی توجیہہ کرسکتے انھوں نے اسلامی فقہ اور حنفی فقہ میں خامیوں کی تلاش شروع کردی وہ جزئیات کو لے کر کلیات اخذ کرنے کا ذہن رکھتے تھے اسے ہم جدید اصطلاح میں سائنٹفک ذہن کہہ سکتے ہیں اس سائنٹفک ذہن کا اطلاق سائنس پر کیا جاسکتا ہے فقہ میں اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا عالم اسلام کی آبادی تقریباً پچاس کروڑ ہے شادی شدہ عورتوں کی تعداد بھی کم از کم دس کروڑ ہوگی اگر دس کروڑ عورتوں سے پنجاب میں دوسو عورتوں نے ارتداد کے ذریعے تنسیخ نکاح کا راستہ دیکھا تو اس سے فقہ اسلامی کی کمزوری نہیں بلکہ پنجابی معاشرے کی خامیاں سامنے آتی ہیں جو مسلمان تو ہوگئے لیکن عہد جاہلیت کے رسوم ورواج کے دائرے

سے نہیں نکل سکے، کیونکہ ہمارے یہاں نومسلموں کی تربیت کا کوئی نظام نہیں رہا لہٰذا ہماری معاشرت قدیم رسومات سے باہر نہیں نکل سکی، ہندوستان میں بھی کم وبیش یہی صورت حال ہے۔ پنجاب میں خاص طور پر اپنی ذاتوں، برادریوں پر فخر کیا جاتا ہے جزو سے کل تشکیل دینے کا یہ مزاج اقبال مرحوم کے ہاں غالب ہے جس سے بڑے مفاسد پیدا ہوتے ہیں اقبال مرحوم نے پنجاب کو عالم اسلام کے مساوی سمجھا اور پنجاب کے چند خاص علاقوں کی خاص برادریوں کے سماجی ومعاشرتی رویوں کمزوریوں سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل فقہ اسلامی میں موجود نہ پا کر فقہ اسلامی کے ذخیرے کو مسترد کر دیا۔ نئے مسائل کے لیے استنباط کیا جاسکتا ہے لیکن بنیادی شرط یہ ہے کہ اسلامی احکامات اسلامی معاشرے، اسلامی تہذیب، اسلامی تمدن سے پیوستہ ہیں۔ آپ معاشرت، تہذیب، تمدن، غیر اسلامی رکھیں اور اس میں فقہ اسلامی پر عمل ناممکن سمجھ کر فقہ کو مسترد کر دیں۔ یہ غلط رویہ ہے، تشنیع فاحشہ کے احکامات میں سختی کیوں ہے؟ چار گواہوں کی شرط کیوں رکھی گئی ہے۔ مذاق اڑانے کے لیے کہہ دیجیے، اس طرح تو کبھی کسی زانی کو سزا نہیں ملے گی تو کیا اسلام صرف سزائیں دینے کے لیے آیا ہے جب بے حیائی اس درجہ پر پہنچ جائے اور گواہ بھی نہ ہوں تو درگزر کر کے غلاظت کو مستور رہنے دیا جائے۔ اب اس بنیاد پر یہ الزام کہ اسلامی قانون ناقص ہے ہماری عقل کے ناقص ہونے کا مسئلہ ہے۔ جدیدیت پسندوں کا یہ طرز عمل صرف عقل پر انحصار کرنے کا نتیجہ ہے یہ عقل کو ذریعہ علم سمجھنے کے بجائے ماخذ علم سمجھتے ہیں اور عقل خود ان کی اپنی ہوتی ہے لہٰذا اصلاً دین کا ماخذ ان کا ذہن ہوتا ہے اسی سے وہ فیصلے کرتے ہیں کس قدر شرم کی بات ہے کہ جن شوہروں کے مظالم کے باعث یہ عورتیں عیسائی ہوئیں ان شوہروں کی اصلاح زجر وتوبیخ معاشرتی مقاطعہ کے لیے پنجاب بھر میں کوئی تحریک نہیں چلائی گئی اور سارے الزامات فقہ حنفی پر ڈال دیے یہ بات بھی ان کے پیش نظر نہ رہی کہ مجبوری کے عالم میں کہا گیا کلمہ کفر ہوتا ہے اس کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں اقبال مرحوم کا خیال تھا کہ ایک فقہی حکم سے عورتوں میں عیسائیت پھیل رہی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ پنجاب کا قدیم معاشرتی نظام عیسائیت کے فروغ کا سبب بن رہا تھا جس کی اصلاح کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی یہ وہی صورت حال ہے جس کے بارے میں قرآن نے بدوؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم اسلام لے آئے ہو لیکن یہ تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اہل پنجاب کا فریضہ تھا کہ وہ مل بیٹھ کر ان ظالم شوہروں سے عورتوں کی گلوخلاصی کراتے۔ یہ اعتراض اسی قسم کا ہے کہ یتیم پوتے کو میراث میں شریعت کوئی حصہ نہیں دیتی اور دادا میراث کا مالک بن جاتا ہے۔ کیا قرآن نے دادا کو اپنی زندگی میں پوتے کو مال دینے کی ممانعت کی؟ کیا میراث میں بھی وصیت کی ممانعت ہے؟ دادا چاہے تو اپنی زندگی میں جس قدر مال پوتے کے لیے ہبہ کرنا چاہے کر سکتا ہے، آخر موت تک توقف کی کیا ضرورت ہے؟ دادا پر کوئی تنقید نہیں کر رہا۔ ساری تنقید اسلام کے قانون میراث پر ہو رہی ہے۔ دادا زندگی میں مال دینے سے کیوں گریزاں تھے، اب وصال کے بعد تو قانون میراث پر عمل ہوگا۔ یہ مسئلہ تو ہندوستان و پاکستان میں عام ہے کہ ماں یا باپ نے زندگی میں مکان ایک بیٹے کے نام پر کر دیا، وصیت کر دی یا اعلان کر دیا۔ مختلف وجوہات کے تحت

مثلاً بیٹا اچھا خادم ہے یا مکان کی تعمیر میں سب سے زیادہ روپیہ اس بیٹے نے لگایا یا غریب ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن کاغذات میں نام تبدیل نہیں ہوا۔ خطرہ یہ ہے کہ اگر بیٹے نے خدمت نہ کی تو مکان سے بھی جائیں گے، انتقال کے بعد ایسی جائیداد تمام ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہو جاتی ہے کیونکہ جب تک ملکیت اور قبضہ منتقل نہ ہو جائیداد میں سب ورثاء کا حصہ رہتا ہے۔ اب شریعت پر اعتراض کیا جا رہا ہے کہ متوفی کی وصیت تھی کاغذ موجود ہے اور شریعت اس وصیت کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ شریعت آپ کی خوہش نفس کی تسکین کے لیے نہیں آئی اپنے نفس کو شریعت کے سامنے جھکا دیجیے یہی دین ہے ہر بات پر اعتراض ہر مسئلے میں عقلی دلیل سے شریعت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اصل سوال یہ ہے کہ دادا نے موت تک توقف کیوں کیا؟ اگر پوتے سے محبت تھی تو زندگی میں مال سپرد کرتے۔ اگر بہو پر اعتماد نہ تھا تو کسی کو سرپرست مقرر کرتے۔

مغرب سے مغلوبیت نے اقبال مرحوم کو یہ باطل خیال پیش کرنے پر مجبور کیا کہ اسلامی قانون کی روح جمہوری ہے جمہور اور اجماع کی اصطلاحات سے یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھے کہ نئے مسائل پیش آنے پر جمہوری طریقے سے لوگوں کی رائے لے کر [ریفرنڈم وغیرہ] قانون وضع کر لیا جائے گا اور غالباً اسمبلی ان کی نظر میں اجماع اور جمہور کا متبادل تھا فقہ اسلامی میں جمہور سے کیا عوام الناس مراد ہیں اقبال مرحوم اس اصول سے تو آگاہ ہوں گے لیکن اس کی تفہیم انھوں نے مغربی منہاج میں کی تو یہ گمراہی خود بخود پیدا ہوگئی اور اقبال مرحوم کے یہاں ایسی بے شمار گمراہیاں ملیں گی اقبال مرحوم نے یہ اجتہاد بھی فرمایا کہ ''اسلام کے اصولوں کی بنیاد مطلق آزادی اور مساوات پر قائم ہے کسی کو دوسرے پر قانونی یا دینی برتری حاصل نہیں سیاست اسلامی کا بنیادی اصول انتخاب ہے جو خلافت کو جمہوریت کی شکل دیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اس اصول کی صراحت کی گئی ہے اقبال مرحوم کے یہ تمام اجتہادات مغربی فکر و فلسفے کی پیداوار ہیں۔ ان اجتہادات سے اسلامی تاریخ و تہذیب کا دامن خالی ہے۔ جمہوریت ایک خالص مغربی اصطلاح ہے لہذا اسے اسلامی تاریخ و تہذیب اور فقہ میں ڈھونڈنا درست نہیں ہے جمہوری اداروں کو اسلامی تاریخ میں تلاش کرنا اسلام کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت ہے قرآن کریم میں ملوکیت کی مذمت اور جمہوریت کی مدحت کہاں ہے؟ انبیاء کی اولاد ان کے بعد ملوک بنی تو ملوکیت قرآن سے ثابت ہے اسے قابل نفرت قرار دینے کی شرعی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ جمہور کو جمہوریت اور جمہوری عمل قرار دینا اسلامی فقہ سے ناواقفیت ہے آزادی اور مساوات کو اسلام میں ڈھونڈنا اسلام سے ناواقفیت ہے یہ تو مغرب کے مسائل ہیں، ہماری کونیات Cosmology میں ماں باپ کے برابر نہیں ہوسکتی۔ بیٹا باپ کے برابر نہیں ہوسکتا۔ پیغمبر خدا کے برابر نہیں ہوسکتا تابعی صحابی کے برابر نہیں ہوسکتا عمرؓ ابو بکرؓ کے برابر نہیں ہوسکتے۔ عشرہ مبشرہ اور سابقون الاولون کے برابر کوئی نہیں ہوسکتا فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والوں کے برابر نہیں ہوسکتے۔ متقی، عابد، زاہد، فاسق فاجر کے برابر نہیں ہوسکتا۔ لہذا مساوات کا اصول تو اسلام میں ممکن

ہی نہیں یہ خالص کافرانہ اصطلاح ہے مساوات صرف ان معنوں میں ہے کہ سب اللہ کے عبد ہیں خواہ وہ عابد ہوں یا زنا کار لیکن اسلامی معاشرے میں زنا کار کی گواہی قبول نہیں ہوگی اور اسے کوئی اہم منصب نہیں دیا جائے گا اور کوڑے مارے جائیں گے رجم بھی کر دیا جائے گا اور جلاوطن بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسلام اور آزادی دو متضاد نظریات ہیں اسلام تو اللہ کی غلامی کا نام ہے دنیا میں کوئی بھی آزاد نہیں انسان یا تو اللہ کا غلام ہے یا شیطان کا لہٰذا آزادی کا فلسفہ تو خالص مغربی فلسفہ ہے۔

حنفی مکتب فکر پر اقبال مرحوم کا اعتراض کہ زندگی کی تخلیقی آزادی اور اس کے عدم تعین سے سہو نظر کر کے منطقی طور پر ایک کامل فقہی نظام کو احناف نے عقل محض کی بنیاد پر استوار کیا، فقہ اسلامی اور فقہ حنفی سے اقبال مرحوم کی لاعلمی کا ثبوت ہے۔ اقبال مرحوم حنفی فقہ اور فقہا کو عبداللہ ابن وہاب افغانی، ترکی شاعر غالب پاشا جتنی اہمیت بھی نہیں دیتے، یہی وجہ ہے کہ ماجد صاحب نے انھیں درست مشورہ دیا تھا کہ یہ آپ کا دائرہ فکر نہیں ہے اس سے احتراز کیجیے۔

حجازی فقہا کی جانب سے نسلی امتیاز کی بنیاد پر عراقی فقہا کے خلاف شدید احتجاج کا ذکر خطبات میں آیا ہے۔ یہ خالص مستشرقین کے خیالات ہیں اور اقبال مرحوم نے میکس ہیورٹن کے حوالے کثرت سے دیے ہیں۔ اسلامی فقہ کے ذخیرہ پر نقد کرتے ہوئے انھیں اندرونی تنقید کے بجائے بیرونی عناصر یعنی مستشرقین کی تنقید بلکہ تضحیک اور توہین پر اعتماد کرنا پڑا جب کہ مستشرقین کون تھے؟ ان کے سیاسی مقاصد کیا تھے؟ یہ بات عیاں ہے، اقبال مرحوم کا فقہ اسلامی پر نقد مستشرقین کے زیر اثر بہت پیچیدہ اور گنجلک ہو جاتا ہے اور اکثر مقامات پر وہ انہی کی بات اپنے نام سے کرتے ہیں، ان کا یہ کہنا کہ مالکی شافعی فقہا حقیقت پسند تھے جب کہ حنفی فقہ تخیلاتی اور کلامی مباحث کا مجموعہ ہے، نہایت غیر علمی اور نہایت سطحی بات ہے اصلاً وہ فقہ اسلامی کے قیمتی ذخیرے سے ناواقف تھے، اس پر ان کی گہری نظر نہ تھی، چند اہم مشہور کتابیں انھوں نے مترجم کے ذریعے پڑھ ڈالیں اور اس کمزور مطالعے کے بل پر لامحدود دعوے کر دیے، اس میں ان کا اخلاص موجود ہے لیکن اخلاص علم کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ اقبال مرحوم اس بات سے بھی واقف نہ تھے کہ یونانی منطق حنفی اور مالکیوں سے پہلے شافعی فقہا کے یہاں اہم قرار پاتی ہے اور المستصفی میں اسے اصول فقہ کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ ان بنیادی مباحث سے ناواقفیت کے باوجود وہ فقہ اسلامی کی تشکیل جدید جیسے موضوعات پر گفتگو کرنے کی جرأت کر رہے تھے۔ ان کے اخلاص پر مبنی غیر علمی تبصروں کو اسی وقت قبول کیا جا سکتا ہے جب ہم اپنے تخیل کی حدود کو لامتناہی کر دیں۔

فقہ احناف پر اقبال مرحوم کے تبصرے اس قدر سطحی ہیں کہ انھیں پڑھ کر دکھ ہوتا ہے۔ اقبال مرحوم کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ مختلف متحارب مکاتب فکر اور گروہوں کے لوگوں سے خط و کتابت کرتے تھے اور اس خط و کتابت سے حاصل شدہ معلومات کے تبادلے سے کچھ مفروضات قائم کر کے اپنی ذہانت سے بعض غیر معمولی

نتائج اخذ کر لیتے ان میں وہ علمی اہلیت نہیں تھی کہ ان نکات کی تائید وتصدیق متعلقہ کتب سے براہ راست کر سکتے، وہ علم کے بجائے تعقلی وجدان کے سہارے دین پر نقد کرتے تھے۔ لہٰذا ہر محقق ومفکر نے اپنے حساب سے اخذ شدہ ادھوری، جانبدارانہ معلومات انھیں مہیا کر دیں۔ انہی معلومات پر انھوں نے اسلامی علوم پر نقد فرمایا ہے۔ احمد دین امرتسری کے مکتب فکر سے بھی ان کے مراسم اور خط وکتابت تھی۔ امت مسلمہ کے علامہ عرشی اور صوفی تبسم ان سے مستقل رابطے میں رہتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ احمد دین صاحب کی اقبال مرحوم سے ملاقات ہو جائے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ حنفیوں کے خلاف یہ جارحیت وہاں سے ملی ہو کیونکہ احمد دین امرتسری صاحب اہل حدیث تھے، تاریخی طور پر ذخیرہ فقہ میں مالکی اور حنفی مذاہب فقہ دوسرے مذاہب فقہ پر برتری رکھتے ہیں۔ اقبال مرحوم نے ان مباحث میں امام داؤدؒ ظاہری کا ذکر نہیں کیا، جو امام شافعیؒ کے مقلد تھے اور آخر کار قیاس کا انکار کر بیٹھے جب کہ اقبال مرحوم قیاس کو زندگی کا منبع کہتے ہیں۔ قیاس کا یہ انکار فقہاء حجاز کے پیروکار کی طرف سے کیا گیا تھا۔ احناف کی طرف سے نہیں۔ اقبال مرحوم نے قیاس کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر اجتہاد کو اسی پر منحصر کر دیا ہے جو غلط اصول ہے۔ قیاس محض ایک طریقہ ہے، اجتہاد قرآن وسنت اور مقاصد شریعت میں محصور ہے، ان اصولوں، حکمتوں، مقاصد، تغیرات کی بازیافت، ان کا اطلاق، حالات وزمانہ کی رعایت سب اجتہاد کے ہمہ گیر عمل کا حصہ ہیں۔

اقبال مرحوم نے فقہ حنفی پر اعتراض کرتے ہوئے قیاس پر نقد کیا ہے اور اسے ظنی عقلی استدلال کہہ کر ارسطو کی منطق سے جوڑ دیا ہے جبکہ حنفی فقہ کے تشکیلی زمانے میں یونانی منطق کا استعمال کبھی نہیں کیا گیا یونانی منطق سے استدلال بہت بعد کے زمانے میں ہوا لیکن اقبال مرحوم کو یہ بنیادی بات بھی معلوم نہ تھی کہ احناف کے فقہی قیاس اور یونانی منطق میں کوئی مطابقت نہیں اقبال مرحوم فقہ پر منطق یونانی کے اثرات کی تاریخ سے بھی لاعلم تھے ورنہ یہ اعتراض وارد نہ کرتے۔

اقبال مرحوم کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ حدیث سے استدلال کا طریقہ استخراجی ہے یا استقرائی جب کہ وہ احناف پر طنز کرتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہتے تھے کہ حجازی اور عراقی سامی اور آریائی سوچ رکھتے ہیں لہٰذا حجازی استقرائی طریقہ اختیار کرتے ہیں اور عراقی استخراجی طریقے کے قائل ہیں ممکن ہے کسی مستشرق نے حسب عادت کسی کتاب میں یہ جھوٹ گھڑا ہو اور اقبال مرحوم کو یہ جملہ پسند آ گیا ہو سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ حنفی مکتب فکر پر جمود تقلید ٹھہراؤ یونانی منطق سے مرعوبیت کے بے بنیاد الزامات عائد کرنے کے باوجود خطبات میں تسلیم کر لیتے ہیں کہ دوسرے مکاتب کے مقابلے میں حنفی مکتب تخلیقی اکتساب کی بہت زیادہ قوت رکھتا ہے اگر حنفی جامد مقلد اور یونانی منطقی تھے تو پھر تخلیق کا سوتا ان کے مکتب فکر سے کیسے پھوٹ گیا اقبال مرحوم کے یہاں اس طرح کے تضادات بے شمار ہیں کیوں کہ بیشتر آراء ان کے مطالعے کا حاصل نہیں ہیں بلکہ ادھر ادھر سے استفادہ کر کے اپنے نام سے دین کی تشکیل کا دعویٰ کر دیا گیا ہے جو تضادات سے پر ہے۔ اسی لیے یہ دعویٰ کبھی قبولیت حاصل نہ کر سکا۔

دینی علوم سے کامل بے خبری اور اسلامی فقہ کے عظیم الشان ذخیرے اور علم التفسیر اور علم الحدیث کے اصولوں سے عدم واقفیت کے باعث اقبال مرحوم کے یہاں گمراہیوں کا ایک طویل سلسلہ در آتا ہے معارف میں عموماً ان گمراہیوں پر سکوت کا ایک سبب یہ تھا کہ اقبال مرحوم کی ذات سے اور ان کے شاعرانہ کمالات سے ملت کو جو فائدہ پہنچ رہا ہے اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو مولانا ماجد تو اس معاملہ میں بہت غیرت مند تھے اور چاہتے تھے کہ اقبال مرحوم کے کفر کے خلاف جو کچھ لاوا ان کے دل میں ہے کتابی صورت میں تحریر کر دیں لیکن ان کو قائل کرنا پڑا کہ صبر سے کام لیں۔ اقبال مرحوم ملت کا اثاثہ ہیں ان کی شاعری نے زخموں کی رفوگری کی لہٰذا ملت سے اس کا روحانی سہارا چھن نہ پائے بلکہ انھیں آمادہ کیا کہ وہ تحریریں بھی شائع نہ کریں جو اقبال مرحوم کے نام جارحانہ لب و لہجے میں لکھی گئی تھیں۔ ماجد صاحب نے ان کے الحاد و کفر کو دلائل سے ثابت کرتے ہوئے انھیں متنبہ کیا تھا کہ وہ اس دریا کو پایاب نہ کریں۔ ماجد صاحب اقبال مرحوم کے مداح تھے لہٰذا وہ قائل ہوئے، اقبال مرحوم کے انتقال کے بعد بھی ماجد صاحب نے احتیاط کو ملحوظ رکھا البتہ اپنے شذرات میں کبھی کبھی خطبات اقبال مرحوم کی گمراہیوں کے بارے میں دلچسپ اشارے کرتے رہتے ہیں۔ اگر ان اشاروں کو مرتب کر لیا جائے تو خطبات پر ماجد صاحب کا نقد سلیقے سے مرتب ہو سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی قاری نے ان سے استفسار کیا کہ کیا خطبات کا ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ اب کیا ہوگا تو ماجد صاحب نے تیکھے انداز میں صدق میں جواب دیا تھا کہ اقبال مرحوم سرسید جب یورپ کے سامنے اسلام پیش کرتے ہیں تو ڈرتے رہتے ہیں کہ کوئی بات بھی زبان سے ایسی نہ نکل جائے جو یورپ کو ناگوار ہو۔ خطبات اگر ترجمہ ہو گئے تب بھی اس کے فروغ کا دائرہ بہت محدود رہے گا اور یہ فتنہ کبھی پھیل نہ سکے گا۔ مولانا دریا آبادی کا یہ اعتماد کتنا درست تھا؟ خطبات کو میں فتنہ اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ اقبال مرحوم نے ان مباحث سے رجوع کر لیا تھا اور نظر ثانی کر رہے تھے انھیں اس کا موقع نہ ملا۔

جہل تو ویسے ہی عذاب ہے لیکن اگر جہل مقدس ہو تو اس کی تباہ کاری بڑھ جاتی ہے۔ مسلم جدیدیت پسند اپنے جہل کو مقدس بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس لیے یہ مسلم لبرل ازم سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ جدیدیت اور اسلام کا کیا تال میل اس کے نتیجے میں جو مرکب وجود پذیر ہوتا ہے اسے دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ نمک اپنا ذائقہ کھو چکا ہے۔

اقبال مرحوم کے یہاں اتنے انحرافات، تضادات کے باوجود ایک کشش اور دلکشی ہے، ان کی دلنواز شخصیت ہر دردمند دل کو کھینچتی ہے، اس کی وجہ ان کا عشق رسالت اور علماء سے محبت ہے۔ اس محبت کے باعث ان کی خاک مشک وغیرہ کے مساوی ہو گئی ہے۔

گلے خوشبوئے در حمام روز لے رسید از دست محبوبے بدستم
بد و گفتم کہ مشکی یا عبیری کہ از بوئے دلاویز لے تو مستم

بگفتا من گل ناچیز لودم ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہمنیش درمن اثر کرد وگر نہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اقبال مرحوم کی شان میں غالباً عبداللہ العمادی نے یہ شعر کہے تھے:

تجھ پہ اے پنجاب نازل ہوں خدا کی رحمتیں اے کہ تو اقبال کی دولت سے مالا مال ہے
ہم نے مانا تو نہیں مسحور تہذیب فرنگ تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام ہے اقبال ہے

تقلید، حدود، نفسیات اور اسلام:

حدود کے بارے میں اقبال مرحوم لکھتے ہیں کہ:

Rules relating to penalties for crimes are in a sense specific to that people and since their observance is not an end in it sell, they cannot be strictly enforced in the case of future generations.

یہ خیال بھی اقبال کا نہیں ہے۔ استاد محترم مولانا شبلیؒ کا ہے لیکن اقبال نے اسے اپنے نام سے پیش کیا ہے۔ اس خیال کی حقیقت کا منبع شاہ ولی اللہ کی اصل عبارت میں تحریف ہے۔

جاوید نامہ میں اقبال تقلید کی مخالفت کرتے ہیں۔

زندہ دل خلاق اعصار و دہور
جانش از تقلید گردد بے حضور
ای بہ تقلیدش اسیر، آزاد شو
دامنِ قرآں بگیر آزاد شو

لیکن اسی جاوید نامہ میں اقبال انتشار ملی سے بچنے کے لیے تقلید کی بھرپور تائید کرتے ہیں اور انحطاط کے دور میں اسلاف کی تقلید کو محفوظ راستہ تصور فرماتے ہیں۔

مضمحل گردد چو تقویم حیات ملت از تقلیدی گرد ثبات
راہ آبارو کہ ایں جمعیت است معنی تقلید ضبط ملت است
در خزاں ای بے نصیب از برگ و بار از شجر مگسل با امید بہار
پیکرت وارد اگر جان بصیر عبرت از احوال اسرائیل گیر

وغیرہ وغیرہ

آخری خطبے میں Is religion Possible میں اقبال نے مذہبی زندگی کو عقیدے کی شعوری پابندی سے لے کر نفسیات تک کل تین مراحل میں تقسیم کیا ہے۔[۱]Faith[۲]thought [3] Discovery ان کے خیال میں آخری مرحلے میں فرد absolute سے ہم آہنگ ہو کر اپنی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے۔ اور شریعت

کوشعور کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے۔ سترہویں صدی سے پہلے سائیکالوجی کا کوئی وجود نہ تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ سترہویں صدی سے پہلے جو لوگ گزر گئے وہ مذہبی زندگی کے اس تیسرے مرحلے سے محروم رہے۔ ان کی شخصیت نامکمل رہی۔ بلکہ عہد رسالت کے صحابہ کرام بھی کیونکہ وہ سائیکالوجی سے واقف نہ تھے۔ LOGOS اور MYTH کی فلسفیانہ بحثیں قدیم ہیں۔ ان بحثوں کو جانتے ہوئے بھی LOGOS سے نکلنے والی LOGY کے منہاج پر علوم اسلامی کو پرکھنا اور مذہبی زندگی کی بنیاد رکھنا مغربیت کے سوا اور کیا ہے؟ اقبال پیغمبر کو سائیکو پیتھ کہنے والے مغربی مفکرین پر نقد کیے بغیر ان کے تصور کو قبول کر لیتے ہیں یہ بڑی گمراہی کی بات ہے۔

علم سائیکالوجی کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں علم نفسیات کے مبادی میں روحانیات کا کوئی دخل نہیں، مغربی تہذیب و فلسفے نے نفس میں اور حیات انسانی میں جو خلل پیدا کیے ہیں اس نے فطرت انسانی کو مسخ کر دیا ہے اور انسان کا زندگی سے اعتبار اٹھا دیا ہے۔ نفسیات اس مسخ شخصیت کو مزید مسخ ہونے سے بچانے کا طریقہ ہے۔ وہ روح سے نہیں صرف وجود سے بحث کرتی ہے۔ اس کا روح سے یا روحانیت سے کوئی رابطہ نہیں۔ یہ مغربی تہذیب کی نفسیاتی خواہشات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسانی امراض کا مادی علاج ہے۔ اسے روحانیت سے وابستہ کرنا ایک غیر علمی طریقہ کار ہے۔ مستقبل قریب میں نفسیات کی وسعت اس تنقید کو اور واضح کر دے گی۔ نفسیات مغربی علوم سے نکلی ہے جس علم کی بنیاد دنیا حرص دنیا اور صرف دنیا ہو اس کا روح سے کیا تعلق؟ افسوس یہ ہے کہ ہم علوم عقلیہ کو غیر جانبدار علوم تصور کرتے ہیں۔ یہ تصور خطرناک، باطل اور غلط تصور ہے۔ دنیا میں کوئی علم غیر جانبدار نہیں ہوتا، علوم عقلیہ کا ماخذ وہ مابعد الطبیعیات ہوتی ہے جس پر وہ قوم یا تہذیب یقین رکھتی ہے۔ اسلامی تہذیب میں تمام علوم عقلیہ کا ماخذ علوم نقلیہ ہیں۔ یہ دونوں توام ہیں، انھیں ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا تاریخ علوم سے ناواقفیت ہے۔ مغربی علوم نقلیہ مذہب کے انکار کے بعد سترہویں صدی سے شروع ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی مابعد الطبیعیات انکار مذہب انکار آخرت اور طلب دنیا ہے سائیکالوجی میں روح کہاں ہے روح تو تجربیت سے قابل ادراک نہیں لہٰذا نام روح کا ہے اصلاً نفس انسانی زیر بحث ہے۔ اقبال مرحوم نے یہی غلطی کی انھوں نے سائیکالوجی کو اسلام سے برآمد کر لیا بلکہ اسے مابعد الطبیعیات کا متبادل قرار دے دیا۔ ایک جزوی علم کلی علم کا متبادل کیسے ہوسکتا ہے۔ سائیکالوجی مغرب کے مذہب Capitalism، Humanism اور اس کی اقدار Freedom، Liberty، Equality سے نکلی ہے تو یہ علم جزوی، مغربی مابعد الطبیعیات کا متبادل کیسے ہوسکتا ہے۔ جہاں تک معاملہ اسلام کا ہے اسلام اور سائیکالوجی میں کوئی مماثلت نہیں، یہاں روح اور نفس دونوں موجود ہے۔ سائیکالوجی روح کے وجود کے انکار کا نام ہے۔

شعور، لاشعور، ضمیر کا اطمینان یہ سب مغربی فکر و فلسفے کے مخمصے ہیں۔ نیچر پرستی کے نتیجے میں ادراک الٰہی یعنی مشاہدہ حق کی گفتگو ہی اصل دین بن جاتی ہے۔ جس سے اعمال، عبادات، اطاعت،

احسان، تقویٰ، ایمان، اسلام کی صفات رخصت ہو جاتی ہیں اور صرف ادراک الٰہی ہی اصل دین ٹھہرتا ہے جو تفکر و تدبر سے اور فکر و شعور کی خاص حالت سے برآمد ہوتا ہے۔ اسی لیے منکرین حدیث تمام زور تدبر و تفکر پر دیتے ہیں وہ نماز ترک کر دیں گے یا جماعت نماز سے دانستہ گریز کریں گے اور اوقات نماز میں تدبر و تفکر قرآنی کو عین دین اور اصل عبادت سمجھیں گے۔ نماز کو محض رسم قرار دیں گے۔ اقبال کا ادراک حقیقت مطلقہ کا فلسفہ اسی مغربی منہاج علم، شک، تحقیق، تجسس، جستجو سے نکلتا ہے جس کا مقصد صرف دریافت حقیقت ہے اطاعت نہیں، اس لیے آج تک کسی مغربی سائنس دان نے حقیقت مطلقہ کو مظاہر و آثار کائنات کے ذریعے پہچان لینے کے باوجود عبودیت، سرافگندگی اطاعت کو اختیار نہیں کیا، کیونکہ اصل عبادت تو ادراک ہے وہ منزل آ گئی تو عبادت کی کیا ضرورت ہے؟ تمام مغربیت پسند، اسی فلسفے کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ قرآن و سنت اور آثار صحابہ سے جو چیز متفق علیہ ہے کہ مذہبی زندگی اطاعت کے منہاج پر منحصر ہے۔ اس زندگی کو اسلامی اصطلاحات یقین، علم، تقویٰ، احسان محسن متقی مومن مسلم کی صفات میں تو بیان کیا جا سکتا ہے لیکن اسلامی زندگی کے لیے مغربی الحادی اصطلاحات کا استعمال مغرب سے مرعوبیت اور مغرب کو مذہب پر فائق سمجھنے کے سوا کچھ نہیں۔ اقبال مذہب کے امکان کے معاملے کو اعلیٰ ترین روحانی تجربے سے مشروط کرتے ہیں، عقیدے سے عمل اور پھر اعلیٰ ترین روحانی تجربے کے سہ رکنی درجات کی تقسیم، علوم اسلامی کی تاریخ کے لیے ایک اجنبی تصور ہے۔ عبادت کا مقصد کیا ہے اور کیا نہیں ہے اس بارے میں قرآن و سنت آثار صحابہ ہماری مکمل رہنمائی فرماتے ہیں۔ لیکن اقبال کے خیال میں یہ رہنمائی جدید انسان کے لیے کارآمد نہیں لہٰذا اس خطبے میں رہنمائی کا ایک ایسا تصور پیش کیا جاتا ہے جو علوم اسلامی میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ تصورات لفظی اور معنوی طور پر بھی درست نہیں ہیں۔ یہ اصطلاحیں بھی قابل قبول نہیں۔ اقبال نے اس خطبے کے مباحث میں اپنی تقسیم کو مرکزی کردار عطا کیا ہے لیکن تقوی، یقین، احسان وغیرہ کی اسلامی اصطلاحات سے کامل بے اعتنائی برتی ہے۔ حیات روحانی کی معراج کیا ہے؟ ایک مومن ایمان کے درجہ کامل پر کب فائز ہوتا ہے۔ جب وہ احسان کے درجے میں ہوتا ہے یا جب وہ فکر و شعور کی اس خاص حالت میں ہوتا ہے کہ اسے obsolute reality کا فہم و ادراک حاصل ہو جائے اور ذہن کی گہرائیوں سے وہ قانون کی اصل تک رسائی حاصل کرے۔ کیا روحانی زندگی کا حاصل Ego یا Self کی بازیافت ہے؟ کیا ادراک خداوندی کے مرحلے میں داخل ہوتے ہی نفس اپنے کمالات سے آگاہ ہو سکتا ہے اور اس کی حقیقت اس پر آشکار ہو سکتی ہے اور کیا وہ اس مرحلے میں خودی کی پرورش کا مکلّف ہو جاتا ہے؟ اقبال نے یہ تمام مراحل بیان کیے ہیں جو محض مفروضات ہیں جن کی کوئی بنیاد نہ دین میں ہے نہ کفر میں نہ فلسفے میں نہ سائنس میں نہ نفسیات میں یہ اقبال کے نفسیاتی وساوس ہیں۔ قلب ماہیت کا عمل ایمان، عقیدہ، تقوی سے احسان تک مرحلہ بہ مرحلہ طے ہوتا ہے یا یہ سفر نفسیات کے کفر سے طے کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نفسیات کی حدود سے واقف ہیں اس پر نقد بھی کرتے ہیں لیکن اس میں امکانات کی لامحدود صورتیں بھی دیکھتے ہیں یہاں تک کہ اقبال کے یہاں ایمان

کامل کی آخری منزل نفسیات کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اس آخری منزل کے بارے میں وہ بتاتے ہیں:

Metaphysic is displaced by pcychology and religious life develops the ambission to come into direct contact with the ultimate reality.

کیا اقبال کے یہاں تصوف اور سائیکالوجی ایک ہے یا سائیکالوجی روحانیت کا اعلیٰ ترین علم ہے۔ مابعد الطبیعیات کو نفسیات سے بدل دینا ذہنی افلاس کی انتہا ہے۔ مغرب نے یہی کیا ہے۔ مابعد الطبیعیاتی مسائل فلسفے سے خارج ہو رہے ہیں۔

جدید سائنس، قدیم سائنس، یونانی فلسفے، مغربی فلسفے کے ذریعے کیا ultimate reality کا ادراک ممکن ہے، سب کا جواب ایک ہے اور وہ نفی میں ہے جب تمام فلاسفہ اور سائنس دان اس پر متفق ہیں تو اقبال اس مرحلے کو سائنس کے ذریعے کیسے ممکن بنا سکتے ہیں؟ جدید فلسفہ کے بانی اور شارحین اور اس فلسفے سے نکلنے والی سائنس کے مفکرین فلسفہ اور سائنس کے ذریعے مذہب کا اور اعلیٰ ترین روحانی تجربے کا امکان دور دور تک نہیں دیکھتے تو اقبال کو یہ امکان کیوں نظر آتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے تصورات جو اقبال کے ذہن و قلب میں راسخ تھے انھیں مغرب کی نفسیات سے خلط ملط کر دیا گیا اور اس کے آمیختہ سے مغرب اور مغرب سے متاثرین کے لیے یہ چیستاں تخلیق کی گئی جس کی گتھیاں اقبال بھی نہ سلجھا سکے۔

اقبال نے فطرت کی تفہیم کے تمام مطالعات کو یکساں درجہ دیا ہے اور اسے اس عہد کے محسوسات کا حاصل ٹھہرایا ہے جو ہری طور پر انھیں ہندی، یونانی، مسلم اور (Modern Atomism) میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یہ دعویٰ اسلامی تاریخ میں بہت بڑا دعوی ہے یہ وحدت ادیان کے تصور کی فلسفیانہ وکالت ہے۔ اس نقطہ نظر کے ذریعے اقبال تمام تہذیبوں مذاہب اور تہذیب جدید میں جو ہری طور پر کوئی فرق روا نہیں رکھتے انھیں ایک ہی سطح پر دیکھتے اور دکھاتے ہیں، اس نقطہ نظر کا ثمر یہ ہے کہ اسلام اور ماڈرن ازم میں جو ہری طور پر کوئی تضاد باقی نہیں رہتا اور یہ تہذیبیں مابعد الطبیعیاتی طور پر بھی ایک ہو جاتی ہیں اس تصور کے نتیجے میں ضلالت اور حق، باطل اور الحق، کتاب فلسفہ اور سائنس اور الکتاب میں کوئی جو ہری فرق باقی نہیں رہتا۔ اقبال کا یہ کہنا کہ فطرت کی تفہیم کی کسی ایک مخصوص شکل پر اصرار درست نہیں ہے سیدھا سادے لفظوں میں وحدت ادیان کا فلسفہ کفر ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

کیا اسلام جمہوری مذہب ہے؟

اقبال مرحوم لکھتے ہیں کہ جمہوریت کا اصل ماخذ تو اسلام اور عہد خلافت راشدہ ہے۔ جمہوریت کی بنیادیں اس زریں عہد میں تھی، امیہ اور عباسی اس میں رکاوٹ بن گئے، اب مغرب میں جمہوریت، پارلیمینٹ کا ظہور ہماری ہی روایت کا ظہور ہے لہٰذا جمہوریت کا خالق مغرب نہیں اسلام ہے یہ بھی بے بنیاد دعویٰ ہے۔

جمہوریت اور جمہوری عمل کا اسلام سے کیا تعلق اور خلافت اسلامی سے کیا تعلق؟ موجودہ جمہوریت تو سترہویں صدی کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ یونان کی جمہوریت بھی موجودہ جمہوریت سے الگ تھی لہٰذا اسلامی جمہوریت ایک بے معنی اصطلاح ہے۔ شورائیت کہہ سکتے ہیں، قرآن بتاتا ہے کہ فرعون کی بھی شوریٰ تھی اور ملکہ سباء کی بھی شوریٰ تھی جب حضرت سلیمانؑ کا خط ملا تو سباء نے اپنی شوریٰ سے مشورہ کیا جب حضرت موسیٰ نے فرعون کو للکارا تو اس نے بھی شوریٰ سے مشورہ کیا اور اس کی شوریٰ کے ایک رکن نے حضرت موسیٰ کے حق میں بہت کلمات خیر کہے اور فرعون کو انتباہ کیا تو شورائیت، نظام استبداد اور آمریت میں بھی رہتی ہے، ملوکیت میں بھی ہوتی ہے اور خلافت میں بھی ملتی ہے۔ مغرب کا یہ تصور کہ ملوکیت، خلافت، آمریت میں کوئی مشورہ نہیں کیا جاتا تھا۔ فرد واحد حکومت کرتا تھا، محض فریب نظر ہے، جمہوریت میں بھی اصل اقتدار کیا عوامی نمائندوں کے پاس ہوتا ہے۔ یہ بھی محض فریب نظر ہے، اصل اقتدار تو ان لوگوں کے پاس ہوتا ہے جو پارلیمینٹ میں موجود نہیں ہوتے، یہ اقتدار نوکر شاہی کے پاس ہے۔ تمام قوانین وہی تیار کرتے ہیں، جمہوری نمائندے ان پر صرف دستخط کرتے ہیں اکثر کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس مسودے پر دستخط کر رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ اسلام اور خلافت کا نظام خالصتاً جمہوری ہے۔ تاریخ اسلام کے لیے اجنبی تصور ہے۔

اب دیکھیے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا اعلان پہلے کیا گیا بیعت بعد میں ہوئی۔ خلیفہ تو انھیں مقرر کر دیا گیا اس تقرری کا فیصلہ عوام نے نہیں ارباب حل وعقد نے کیا۔ یہ کون لوگ تھے؟ کیا یہ منتخب ہوئے تھے؟ کیا رسول اللہ نے انھیں خلافت کے فیصلے کا اختیار دیا تھا۔ عہد رسالت میں یہی لوگ رسالت مآب کے قریب تھے۔ لہٰذا یہی فطری قائدین تھے ان کو جمہور سے توثیق وتصدیق کی ضرورت نہ تھی ان کی حیثیت مسلمہ تھی جس طرح اہل عرب اپنی اولاد کو پہچانتے تھے، اسی طرح ان لوگوں کی اہمیت، حیثیت سے بخوبی واقف تھے، لہٰذا کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ ہر کہہ ومہہ کو خلافت کے فیصلے میں نہ شریک کیا جا سکتا تھا نہ شریک کرنے کی ضرورت تھی۔ اتنے اہم منصب کا فیصلہ ارباب حل وعقد کریں گے یا ہر ایک سے پوچھا جائے گا قرآن کریم اس معاملے میں واضح ہدایات دیتا ہے جس سے جمہوریت کے فلسفہ عوام کی نفی ہوتی ہے۔ قرآن حبل اللہ کے مقابلے پر حبل الناس کی اصلاح استعمال کرتا ہے اور یہودیوں کے ذکر میں اس اصطلاح کا خاص محل ہے کہ یہ ہمیشہ حبل الناس کے ذریعے سامان زندگی مہیا کریں گے اور قیامت تک سہارے کے بغیر دنیا میں کبھی قیام نہ کر سکیں گے۔ خلافت عام آدمی کا مسئلہ ہی نہیں تھا حضرت ابوبکرؓ نے اپنی زندگی میں حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ اس کا جمہوریت سے کیا تعلق تھا یہ تو نعوذ باللہ آمریت تھی۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے ایک مجلس قائم کر دی یعنی امت میں سے صرف چند لوگوں کے لیے خلافت کو مخصوص کر دیا۔ اور اس کے انتخاب کی بھی ذمہ داری محدود کر دی۔ یہ کیا جمہوریت تھی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو جمہوریت کا اس میں کیا عمل دخل تھا؟ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں خون عثمانؓ پر اختلافات ہوئے نوبت جنگ تک آ گئی تو مسئلہ جمہوریت سے حل نہیں ہوا بلکہ دونوں اصحاب کرام نے حکم مقرر فرمائے اور ان کو فیصلے کا

اختیار دیا۔ اتنے بڑے مسئلے کا حل صرف دو افراد کے سپرد کر دیا گیا کہ یہ دونوں جو کچھ طے کر دیں وہ فریقین کے لیے واجب التعمیل ہوگا۔ اتنے اہم مسئلے میں عوام سے کوئی رائے لی گئی؟ خوارج اسی بنیاد پر تو الگ ہوئے کہ حکم کی تقرری غیر قرآنی ہے پھر قرآن کے ان دعوے داروں نے جو کچھ کیا تاریخ کے اوراق خون سے تر بہ تر ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے لشکر اسامہ روانہ کیا، سب کا اختلاف تھا آپ نے کسی اختلاف کو اہمیت نہ دی۔ فرمایا رسول اللہ کا حکم ہے موخر نہیں ہوسکتا اور خالد بن ولید کی موجودگی میں اسامہ کو سردار لشکر برقرار رکھنے میں کوئی تردد محسوس نہ کیا کہ حکم رسول یہی ہے۔ مرتدین اور مانعین زکوٰۃ کے مسئلے میں تمام صحابہ کی رائے مختلف تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ اپنی رائے پر قائم رہے۔ یہ کونسی جمہوریت تھی، ہمیں تو اسلام میں کہیں مغربی جمہوریت نظر نہیں آئی، اور اسلامی جمہوریت تو کوئی چیز ہی نہیں ہے، معلوم نہیں اقبال مرحوم کو اسلام کی روح میں یہ جمہوریت کہاں نظر آ گئی۔ حضرت علیؓ کے وصال کے بعد حضرت حسنؓ کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔ اس کا فیصلہ کس جمہوریت سے ہوا؟ حضرت حسنؓ حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے اور فرمایا کہ اگر خلافت معاویہؓ کا حق تھا تو انھیں مل گیا اور اگر میرا حق تھا تو میں اس سے دستبردار ہو گیا، اس سال کو امت کی تاریخ میں عام الجمع کا سال کہا جاتا ہے۔ جب امت پھر مجتمع ہو گئی تو امت کو حضرت حسنؓ نے مجتمع کیا یا جمہوریت ریفرنڈم ووٹ کے ذریعے یہ اجماع ہوا؟ طالوت کا انتخاب جمہوریت سے تو نہیں ہوا۔ عوام تو طالوت کے مخالف تھے ان کا انتخاب تو علمی اور جسمانی صلاحیتوں کی بنیاد پر ہوا، ان کے انتقال کے بعد ان کے داماد حضرت داؤدؑ بادشاہ بنے، ان کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے سلیمانؑ ملک بنے، پھر ان کے صاحبزادے ہوئے۔ قرآن نے طالوت کو ملک کہا، ذوالقرنین کو ملک کہا، کہیں ملوکیت کی مذمت نہ کی۔ بنی اسرائیل کے لیے سورہ مائدہ میں فرمایا کہ ہم نے تم میں ملوک بھی پیدا کیے اور انبیاء بھی..... دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا لہٰذا یہ کہنا کہ قرآن اسلام ملوکیت کے خلاف ہے اور جمہوریت کے حق میں ہے باطل خیال ہے۔ اگر اقبال مرحوم کے جمہوری فلسفے کو مان لیا جائے تو قرآن کریم اور خلافت اسلامیہ کے طرز انتخاب کا انکار کرنا پڑے گا اور اسے غیر جمہوری قرار دینا ہوگا پھر اس بات پر بھی شرمندگی ہوگی کہ دو خلفائے راشدین رسول اللہؐ کے داماد تھے اور دو خلفائے راشدین سسر تھے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تو سسر کے نواسے تھے کیا دنیا اس طریقہ کار کو جمہوری مان لے گی۔ مغرب کو خوش کرنے کے لیے جمہوریت کو اسلام سے برآمد کرنے کی کوشش معذرت خواہانہ جدیدیت ہے۔ اقبال مرحوم اسلامی اصطلاح جمہور اور جمہوریت میں فرق نہیں کر سکے۔ ان کا یہ موقف کہ اسلام میں تصور خلافت جمہوریت کی شکل ہے درست نہیں ہے۔ جمہوریت ایک خاص تہذیب و تاریخ کا ثمر ہے۔ اسے اسلامی تاریخ میں ڈھونڈنا معذرت خواہی ہے۔ اگر فی الحقیقت ایسا تھا تو قرآن میں ملوکیت کا تصور اور خلافت راشدہ کے نظائر اقبال مرحوم کے اس موقف کی مکمل تردید کرتے ہیں۔ اگر اسلام میں جمہوریت تھی تو پارلیمینٹ کیوں نہ تھی؟ اگر پارلیمینٹ عین اسلام ہے اجماع کا ادارہ ہے، اسلام کی فطری روح کے عین مطابق ہے تو عہد رسالت خلافت راشدہ اور قرآن کریم میں انبیاء کے معاشرے اس ادارے

کے وجود سے ہمیں آگاہ کیوں نہیں کرتے، اتنے اہم اسلامی ادارے کا اسلامی تاریخ میں کوئی وجود نہیں ملتا۔ بلکہ دنیا کی تاریخ اس وجود سے خالی ہے۔ اب سترہویں صدی کی خاص تاریخ سے نکلنے والی پارلیمینٹ ہی درست ہے باقی سب غلط ہے، یہ طرز فکر دوسرے لفظوں میں اسلام کی تاریخ اور انبیاء کی تاریخ کا انکار ہے۔ یونان کی جمہوریت اپنی تاریخ اور تہذیب کی پیداوار ہے۔ یہی حال مغربی جمہوریت کا ہے، اسلام کو مغرب کے سیاسی نظام میں سمونے [یا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام مغرب سے افضل ہے] کے لیے اقبال مرحوم کا نقطہ نظر اسلامی علوم سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اقبال مرحوم نے اصطلاح اجماع سے جمہوریت کا استباط کیا ہے۔ اجماع کے لیے پارلیمینٹ کو موثر ترین اور معتبر ترین ادارہ قرار دیا ہے۔ اگر عالم اسلام کی ایک ہی پارلیمینٹ ممکن ہوتی تو شاید اقبال مرحوم کے اس مفروضے کی کوئی عقلی دلیل مل سکتی، لیکن قومی ریاستوں کی قومی پارلیمینٹوں کے ذریعے قومی اجماع، اجماع جمہور کا متبادل کیسے ہوسکتا تھا۔ اب پندرہ سو سال کے بعد جمہور کی اصطلاح بھی بدل دی جائے تو شاید ممکن ہو۔ اقبال مرحوم صاف لفظوں میں کہتے تھے کہ صرف چار مکاتب فکر کے اجماع کے تصور کو ختم کر کے اس تصور کو وسیع کر دیا جائے۔ صرف اقبال کے کہنے سے مکاتب فکر ختم نہیں ہوسکتے۔ اس امت میں بے شمار مکاتب فکر تھے، سب ختم ہوگئے، صرف چار رہ گئے۔ غیر فطری طریقے سے جو مکاتب ابھرے وہ فطری طریقے سے ختم ہوگئے، خطبات لکھنے اور تقریر کرنے سے نہ کوئی مکتب فکر وجود میں آتا ہے نہ ختم ہوتا ہے۔ اس طرح کے دعوے بلنٹ نے اپنی کتاب میں کیے ہیں اس پر اس ہیچ مداں نے معارف میں دو قسطوں میں تبصرہ لکھا تھا۔ یہ اقبال کی زبان نہیں یہ تو بلنٹ کی زبان ہے۔ یہ عجیب وسعت ہے جو عالمگیر سطح پر متشکل ہونے کے بجائے قومی سطحوں پر قومی اجماع کی صورت میں ظہور پذیر ہوگی۔ اس طرح عالم اسلام میں کبھی اجماع ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ اقبال کے ذہن میں یورپ میں قومی کلیساؤں کے ظہور کی تاریخ واضح نہیں تھی۔ اقبال مرحوم کی اس تجویز سے اسلام کا انجام اس سے برا ہوتا جو عیسائیت کا ہوا قومی کلیساؤں نے عیسائیت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ اجماع جمہور کو جمہوریت اور پارلیمینٹ کی اصطلاحات کے مساوی قرار دینا علوم اسلام کی تاریخ سے کامل ناواقفیت کا اظہار ہے۔ یہ بھی خلط مبحث ہے، اسلام میں اجماع جہلاء کا نہیں ہے اجماع علماء کا معتبر ہے عوام کا نہیں یہ علماء کون ہوں گے اس کے بھی اصول طے ہیں اجماع کی اصطلاح ان تمام اصولوں کا کامل احاطہ کرتی ہے۔ لہٰذا جمہوریت اور جمہوری عمل کے تحت مطلق آزادی مطلق مساوات اور ایک انسان ایک ووٹ کا فلسفہ اجماع کی اصطلاح سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا۔ جمہوریت خواہش نفس کا نام ہے کہ آپ کسے ووٹ دینا چاہتے ہیں، اس کے لیے کوئی شرط نہیں ہر شخص ووٹ دینے کا اہل ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ قرآن وسنت اس کافرانہ تصور کی صریحاً نفی کرتے ہیں۔ جاہل اور عالم، متقی اور فاسق، مشرکین منافقین، منحرفین مختلف طبقات ہیں۔ یہ تقسیم صرف عالم آخرت کے لیے نہیں اس دنیا کے لیے بھی ہے۔ اسلامی ریاست کا سربراہ جاہل شخص نہیں بن سکتا نہ فاسق و فاجر کو امارت مل سکتی ہے کیونکہ فسق و فجور کا خاتمہ ریاست کا بنیادی وظیفہ ہے جب کہ جمہوریت میں کوئی تحدید نہیں ہے۔ اقبال

مرحوم نے خلافت کے خاتمے اور ترکی میں لادینی جمہوری حکومت کے آغاز کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا اور اپنے مقالے اجتہاد میں اسے مسلمانوں کی اجتہادی قوت کے نمونے کے طور پر پیش کیا، لیکن یہ اجتہاد جو آغاز میں بھی محض الحاد تھا، آخر کار الحاد کے سوا کیا نکلا۔ اسلام میں ایسے کسی اجتہاد کی گنجائش نہیں جو بنیادی اصولوں کے بجائے محض نیک خواہشات کے لیے کیا جائے۔ حکومت کی جمہوری شکل کو عین اسلامی قرار دینے کی بات بھی اقبال مرحوم کے مغرب سے متاثر ہونے کی صراحت کرتی ہے۔ اجماع کو لادینی سیاسی نظام کے جمہوری ادارے پارلیمینٹ کا متبادل سمجھنا اقبال مرحوم کی بہت بڑی غلطی تھی۔ آج وہ زندہ ہوتے تو اس خیال سے رجوع کرتے۔ اقبال مرحوم اپنی فکر کا رشتہ شاہ صاحب کے ساتھ ساتھ سرسید سے بھی قائم کرتے ہیں جب کہ سرسید قرآن کو کلام اللہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ سرسید اور مولوی چراغ علی کی خط و کتابت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے جو شخص قرآن کو کلام اللہ ہی تسلیم نہیں کرتا اس سے اقبال مرحوم کا متاثر ہونا عجیب بات ہے۔ غالباً اقبال مرحوم نے سرسید کے افکار کا غائر اور تنقیدی مطالعہ نہیں کیا ورنہ اقبال مرحوم جیسے مومن سے اس غلطی کا صدور محال تھا۔

اقبال مرحوم کا انائے مطلق کیا ہے؟
اقبال مرحوم کا تصور امکان مذہب؟

اقبال مرحوم کا absolute ego انائے محدود، انائے مطلق، مطلق وجود اور وجود کیا ہے؟ کیا ان کے مراتب ہو سکتے ہیں؟ تکملہ وجود کا آخری درجہ کیا ہے؟ مرتبہ وجود اور شہ رگ کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ کیا خدا کائنات سے ماوراء ہے یا کائنات کی عین بن کر کائنات میں مخفی ہے؟ کیا اشیائے کائنات [egoes] اناؤں کے مجموعہ کا نام ہے؟ نفس انسانی میں پوشیدہ حقیقت اور نفس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ کیا اقبال مرحوم وجودی تھے اور ابن عربی سے متاثر تھے؟ عموماً لوگ اقبال مرحوم پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ حضرت شیخ اکبرؒ سے بہت متاثر تھے اور خطبات میں اسی تاثر کی علمی وضاحت مغربی فلسفے کے تناظر میں کی گئی ہے۔ اقبال مرحوم شیخ اکبر کی تعلیمات سے براہ راست واقف نہ تھے۔ شیخ اکبر کو عربی زبان پر عبور کے بغیر پڑھنا اور سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اقبال مرحوم کو ان سے دلچسپی تھی کیونکہ اس زمانے میں یورپ ابن عربیؒ سے بے حد متاثر تھا۔ انگریزی تراجم کے ذریعے وہ شیخ کی تعلیمات پڑھ رہے تھے۔ مجھ سے بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ تعلیمات شیخ اکبر کی تلخیص پیش کردوں تاکہ دوران مطالعہ وہ پیش نظر رہے۔ انھیں مسئلہ زماں ومکاں سے خاص دلچسپی تھی اور مغرب زدہ طبقات اور اہل مغرب کو بتانا چاہتے تھے کہ ہمارے یہاں بھی بہت پہلے ان مباحث پر کام ہو چکا ہے لہٰذا مجھ سے اور مختلف علماء سے شیخ اکبر کی تعلیمات افکار کتابوں کے بارے میں استفسار کرتے رہتے تھے کہ شیخ کے یہاں حقیقت زماں کیا ہے کس کس کتاب میں تفصیل ہے۔ متکلمین اور شیخ کے حقیقت زماں کا فرق کیا ہے۔ ابن عربیؒ کی کتابوں پر اقبال مرحوم کی گرفت کمزور تھی لہٰذا اقبال مرحوم کو ابن عربی کا خوشہ چیں کہنا درست نہیں ایران کی مابعد الطبعیات کے مطالعے کے دوران وہ تصوف سے چڑ گئے اسے مسلمانوں کی تباہی کا سبب خیال کرتے تھے اس کے برعکس Individualism

کی حمایت کرتے تھے جبکہ تصوف کی خاص بات فردیت ہے اسرار خودی کا دیباچہ تصوف پر سخت تنقید تھی حسن نظامیؒ ناراض ہوگئے لہٰذا اسے خارج کر دیا گیا لیکن یہی خیالات اقبال مرحوم نے نکلسن سے انگریزی دیباچے میں لکھوائے جس میں Islamic Pantheism اور All forms of pantheistic sufism کی شدید مذمت کی ہے حیرت ہے کہ اقبال مرحوم مغرب کی دو گمراہیوں فریڈم اور indvidualism کو قبول کر لیتے ہیں لیکن مشرق کے تصوف کو عجمی قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ Absolute Ego سے ملنے اور حیات ابدی حاصل کرنے، فنا ہونے لیکن بقا پانے اور اپنے وجود کی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے Absolute Ego سے ملنے کا تصور لیکن الگ رہنے اور اپنا تفرد بھی برقرار رکھنے کا فلسفہ اقبال مرحوم کا ناقابل فہم نقطہ نظر ہے۔ وہ خدا کی تلاش کو انسان کی تلاش کے معنی میں لیتے ہیں کہ یہی باطن کی تلاش ہے لیکن یہ تلاش خود کیا ہے اس کی تشریح وہی کر سکتے ہیں۔

کیا ذات باری کا ادراک [Rational Intution, Spritual Intituion, Inner Intution] سے باطنی وجدان، روحانی وجدان، تعقلی وجدان کے ذریعے ممکن ہے؟ اگر ایسا ہوسکتا ہے تو دنیا کی تاریخ میں کتنے لوگوں کو اس کا تجربہ ہوا کیا اسلام میں اس تجربے کی کوئی شرعی صورت موجود ہے؟ مغرب میں کتنے لوگ طبیعات میں مظاہرہ خداوندی دیکھنے کے بعد اس روحانی وجدان کے ذریعے حقیقت مطلق تک پہنچے؟ اگر حقیقت مطلق یا انائے مطلق تک نظریہ اضافیت کے ذریعے پہنچنا ممکن تھا تو مغرب میں کتنے لوگ حقیقت مطلق تک پہنچ گئے۔ سائنس دانوں کی تاریخ پڑھ لیجیے کتنے سائنس دان آثار کائنات سے طبیعات کے ذریعے، محسوسات و تجربات کے ذریعے، مابعد الطبیعیات تک پہنچے؟ اگر صرف مظاہر کائنات اور طبیعیات سے خالق کائنات مل سکتا تو مغرب کے ہر جدید انسان اور ہر سائنس دان کو خدا کی معرفت حاصل ہوجاتی اور مغرب کا ہر سائنس دان یا وسیع المطالعہ شخص صوفی اور درویش ہوتا، کتنے درویش پیدا کیے، مغرب نے، کتنے سائنس دان اللہ کے سامنے سر بہ سجدہ ہوئے، سائنس تو اپنے آپ کی پرستش کرتی ہے، اپنے آپ کو سجدہ کرتی ہے، اس مادی سائنس سے روحانیت کشید کرنے کی کوشش تین سو برس کے تجربات نے غلط ثابت کر دی ہے۔ جدید سائنس جو مادیت کی اساس سے نکلی ہے کبھی روحانیت کی سمت رہنمائی نہیں کر سکتی اور مغرب کی پوری تاریخ اس تصور کی تصدیق کرتی ہے۔ اقبال مرحوم نے نظریہ اضافت کی بنیاد پر دین اسلام کے تمام پیمانوں کو از کار رفتہ قرار دے کر نئی تعبیر و تشریح کا راستہ نکال دیا۔ کیا نظریہ اضافیت حکم خداوندی یا وحی الٰہی کا نعم البدل ہے کہ اس کی روشنی میں ہم دین کا جائزہ لیں۔ یہ اقبال مرحوم کی سب سے بڑی غلطی ہے اور ناقابل معافی غلطی کہ مغرب کی سائنس اور فلسفے کو منہاج حقیقی بنا کر دین کی تعلیمات کو اس پیمانے پر جانچا جائے نہ کہ دین کو اصل حقیقی اور درست منہاج سمجھ کر مغرب کے فکر و سائنس کو اس پیمانے سے جانچا جائے۔ مغرب کی عقلیت Rationalism کو اسلام میں ممکن بنانے بلکہ اسلام سے ثابت کرنے کے لیے اقبال مرحوم نے غزالی کے برعکس عقل اور وجدان کو توام بتایا۔ غزالی کی تردید کے بعد وہ اسلام کی فطرت میں عقلیت کو تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ غزالی کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عقل اور فکر لامحدود ہے بلکہ کانٹ کا بھی رد

کرتے ہیں جس نے Critic on pure reason میں عقل کی تحدیدات کا اعتراف کرلیا تھا۔ان معنوں میں اقبال مرحوم تمام جدید فلاسفہ سے بھی آگے چلے جاتے ہیں۔خطبات میں اقبال مرحوم نے جہاں جہاں مغربی فکر وفلسفے کو قرآنی آیات سے ثابت کیا ہے۔یہ تمام استدلال سرے سے غلط ہے۔اقبال مرحوم علم تفسیر سے ناواقف تھے اور انھوں نے قرآن کے انگریزی تراجم کے ذریعے قرآن کو سمجھا اور قرآن کی تشریح خالص عقل کی روشنی میں کی لہٰذا جہاں جہاں بھی قرآنی آیات کو وہ اپنے موقف کے حق میں پیش کرتے ہیں وہاں وہاں وہ ٹھوکریں کھاتے ہیں اور یہ ٹھوکریں تحریفات سے بھی بڑھ کر ہیں۔مغربی فکر وفلسفے کی تائید وتوثیق کے لیے انھوں نے قرآن سے جتنے بھی حوالے دیے ہیں وہ محرف، غلط، بے بنیاد سیاق وسباق سے کٹے ہوئے اور اصل مبحث سے لاتعلق ہیں۔قرآنی آیت میں موضوع کچھ اور ہے۔اقبال مرحوم اس سے اپنے مطالب اخذ کررہے ہیں اور اس اخذ واستفادے میں کوئی اصول زیر بحث نہیں سلف سے خلف تک کسی ایک عالم نے اس طریقے سے قرآن کی تشریح نہیں کی۔

اقبال مرحوم نے آیات کو سباق وسیاق سے کاٹ کر مطالب اخذ کیے ہیں۔ان مطالب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مرحوم کا فہم قرآن نہایت ناقص تھا وہ قرآن کی تشریح وتفہیم پر قادر نہ تھے اور قرآنی الفاظ کا درست مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے۔کیونکہ ان کی عربی استعداد برائے نام تھی۔اگر کوئی مفسر، یا محقق خطبات کی تمام آیات کو سامنے رکھ کر ان کا تنقیدی جائزہ لے تو ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔اسلام کی تشکیل جدید کا دعویٰ کرنے والے اگر قرآن سے ہی واقف نہیں ہیں تو انھیں تشکیل کا کیا حق پہنچتا ہے۔اپنے نظریہ زمان ومکان کے لیے اقبال مرحوم نے قرآنی آیات سے غلط استدلال کیا ہے۔اقبال مرحوم باطنی تجربے، روحانی وجدان، فواد کے ذریعے خدا کے براہ راست مشاہدے وتجربے کو یقینی قرار دیتے ہیں جب کہ یہ نقطۂ نظر گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔انسان کے لیے روح کا ادراک ممکن نہیں تو وہ absolute ego کا دیدار کسی بھی ذریعے سے کیسے کرسکتا ہے؟ ایسا ممکن ہوتا تو کیا حضرت موسیٰ دیدار خداوندی سے محروم رہتے؟ افسوس یہ کہ دیدار الٰہی کی پیغمبرانہ خواہش تو ممکن نہ تھی مگر اقبال مرحوم اپنے فلسفے سے اس کو ممکن بنا دیتے ہیں، انسان کو اللہ کی صفات کا علم حاصل ہوسکتا ہے یا اس کی ذات کا .....اسلامی تاریخ میں یہ متنازعہ مسئلہ نہیں ہے لیکن اقبال مرحوم فرماتے ہیں کہ ذات خداوندی کا براہ راست مشاہدہ ہوسکتا ہے اور اتنے بڑے دعوے کی کوئی دلیل نہیں۔ولیم جیمز کی روحانیت میں تو شاید ممکن ہو اسلام میں ایسا دعویٰ ممکن نہیں، حواس وعقل سے ذات خداوندی کا ادراک ممکن ہی نہیں ورنہ حضرت موسیٰ دیدار الٰہی کی نعمت سے محروم نہ رہتے اور جلال ربانی کا دیدار فرماتے۔اس فلسفے کی بنیاد پر اقبال مرحوم نے نبی اور ولی کو یکساں مقام پر کھڑا کرکے دونوں کے روحانی تجربات کو یکساں قرار دیا۔اقبال مرحوم روحانی تجربے کو عقل کے ذریعے ممکن سمجھتے ہیں۔یعنی وجود خدا، خدا سے ملنے والا علم وحی، پیغمبرانہ دعوے کی تفہیم ان سب کی عقلی معیار پر تصدیق ممکن ہے۔اقبال مرحوم انکار کرتے ہیں کہ خدا کائنات سے باہر نہیں ہے۔دوسرے لفظوں میں جب کائنات ہماری دسترس میں ہے اور دن بدن تسخیر ہوتی جارہی ہے تو ذات خداوندی بھی دسترس سے باہر نہ رہ سکے گی اور باطنی وجدان، عقلی وجدان،

روحانی وجدان کے ساتھ ساتھ آخر کار طبیعیات کے ذریعے انسانی ادراک میں آجائے گی۔ یہ نقطہ نظر بہت بڑی جسارت ہے۔ اس طرح کی جسارتیں ان کے یہاں عام ہیں اور مغربی فلسفے نے انھیں یہ اعتماد بخشا کہ وہ اس قسم کے دعوے کر سکیں جو اسلامی تاریخ میں کسی بڑے سے بڑے عالم نے نہیں کیے۔ مثلاً تقدیر کے مفہوم کو نہ مسلم سمجھ سکے نہ غیر مسلم، نبوت محمدی کی اصل حقیقت عالم اسلام کے کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آئی۔ کسی چیز کی تقدیر خارج میں نہیں بلکہ باطن میں پیوست ہوتی ہے۔ تقدیر کسی بیرونی جبر کے بغیر ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے۔ تقدیر کے تمام ممکنات باطن میں موجود ہوتے ہیں۔ انسان اپنی تقدیر خود بنا سکتا ہے اور تقدیر کو جو معنی جو رنگ دینا چاہے اپنی خودی کے زور پر ہر انسان ہر رنگ اور ہر معنی دے سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان ایک ایسی ہستی ہے جو خود کاتب تقدیر ہے اور لوح تقدیر پر جو چاہے اپنی سعی و جہد سے تحریر کر سکتا ہے۔ دوسرے معنوں میں انسان مخلوق نہیں خالق ہے۔ وہ خودی کے ذریعے خدا بن سکتا ہے۔ یہ تصور مغرب کے Humanism کا چربہ ہے اور انسان کے خالق ہونے کا اعلان ہے۔ نطشے کا ابر ماش ہو بہو یہی ہے۔ اقبال مرحوم کا یہ تصور تقدیر مغرب کے منہاج علم کے عین مطابق ہے لیکن اسلام میں اس تصور کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اقبال مرحوم کے یہاں تضادات کا یہ تنوع غالباً اس وجہ سے بھی ہے کہ اقبال مرحوم نے ۱۹۱۲ کے بعد سے مطالعہ کتب ترک کر دیا تھا وہ صرف قرآن پڑھتے تھے یا مثنوی کبھی کبھار کوئی کتاب دیکھ لیتے لہٰذا صرف قوت حافظہ، سابق مطالعہ، اور زبردست قوت مشاہدہ..... کے زور پر وہ علمی و تحقیقی کام کرتے تھے۔

اقبال مرحوم کے فلسفے میں تخلیقیت، نوع بہ نوع، تسخیر سے پُر خلاقی، تازہ آفرینی، لحہ بہ لحہ تغیر، خودی کے بل پر خدا کو مخاطبت پر مجبور کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت کے نتیجے میں انسان ایک مطلق آزاد وجود بن جاتا ہے جو تقدیر الٰہی کا پابند نہیں اور تکوینی انتظام سے بھی ماورا ہے کیونکہ تقدیر تکوینی انسان کو مجبور ٹھہراتی ہے مثلاً وہ کب پیدا ہو کب مرے اور کہاں پیدا ہو یہ انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ اقبال مرحوم کو انسان کی یہ بے چارگی پسند نہیں، تکوین کے جبر سے کوئی مخلوق آزاد نہیں، فکر و شعور اور جد و جہد سے راستے متعین کرنے کی آزادی ایک الگ چیز ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش تو معجزے کے ذریعے ممکن ہے یہ معجزہ ذات مطلق سے مخصوص ہے لیکن عام لوگوں کے لیے نکاح اور وظیفہ زوجیت کے بغیر اولاد کا امکان محال ہے۔ اولاد کا امکان باطن میں رکھ دیا گیا ہے لیکن اس ممکن کو وجود میں لانے کے لیے اور نوشتۂ تقدیر کو پڑھنے کے لیے کوششیں اور جد و جہد انسان ہی کرے گا۔ اگر تقدیر میں اولاد نہیں لکھی گئی ہے تو پھر کتنی ہی کوشش کرے کتنے امکانات بروئے کار لائے اولاد سے محروم رہے گا۔ قرآن بتاتا ہے کہ، آئندہ کا نقشہ اللہ کے علم میں ہے مکمل طور پر مثلاً ایران پر رومیوں کی فتح کی خوش خبری مشرکین عرب پر مسلمانوں کے غلبہ کی خبر حضرت یوسفؑ کو ستاروں کا سجدہ اور اس کی عملی تعبیر قوم لوط کو پیغام عذاب، فرعون کی غرقابی، ابراہیم کو اولاد کی خوش خبری زکریا کو اولاد کی خوش خبری، یہ سب واقعات مستقبل تو تھے۔ مگر اقبال مرحوم کو ان آیات کے مقابلے میں خدا کی خلاقی زیادہ پسند ہے، اس طرح کائنات خدا کی تقدیر کا جبر بن جاتی ہے اور وہ جبر کو قبول نہیں کرتے۔ تقدیر کو

صرف دعا بدل سکتی ہے اگر قبول ہو جائے۔لیکن اقبال مرحوم کے یہاں یہ تصور کالعدم ہے۔وہ اس تصور تقدیر کو جبر قرار دیتے ہیں اور خدا کی آزادی کے منافی۔ان کے خیال میں یہ تصور انسان کی خودی کو ختم کر دیتا ہے اور اس کی حیثیت کا انکار کر دیتا ہے وہ کائنات میں صاحب حیثیت نہیں رہتا۔اقبال مرحوم خدا کو شعوری تخلیقی زندگی یا ارادہ سمجھتے ہیں۔یہی انا یا نفس ہے سورہ اخلاص خدا کی ذات کا ادراک واضح کرتی ہے۔اقبال مرحوم کا یہ تصور اسلام کے تصور الہ کے برعکس ہے۔وہ کائنات کو خدا کا تخلیقی عمل سمجھتے ہیں جو ہنوز ناتمام ہے گویا خدا تخلیقیت میں مصروف عمل ہے۔اس تصور کے ذریعے وہ سائنس کے اس مفروضے کو ثابت کرنا چاہتے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے ارتقاء پذیر ہو رہی ہے،نئی نئی کہکشائیں بن رہی ہیں، مہ وانجم ڈھل رہے ہیں، ستارے وجود میں آرہے ہیں، خدا مصروف عمل ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ انسان کا درجہ اس قدر بڑھاتے ہیں اور خدا کا درجہ اس قدر گھٹا دیتے ہیں کہ تصور اس کے ادراک سے کانپتا ہے۔

And in this process of progressive change God becomes a co-worker with him provided man takes the initiative.

یہ کائنات محض ذات خداوندی کی ایک صفت کا مادی مظہر ہے۔اقبال مرحوم نے قدریہ و جبریہ فرقوں کی تاریخ پر گہری نظر نہیں ڈالی۔اس عہد کے علمی مناقشے ،فرقہ واریت اور ان ہنگاموں میں امام ابوحنیفہؒ کا متوازن مسلک جس نے ان مسائل کی جڑ کاٹ دی۔اقبال مرحوم انہی مباحث کو جو عقلی زور پر ہر عہد میں برپا ہو جاتے ہیں۔اہم علمی مشق سمجھتے رہے۔اگر وہ پہلی صدی ہجری میں تشیع سے خوارج اور معتزلہ تک کی تاریخ کا غائر مطالعہ کر لیتے تو ان از کار رفتہ مباحث کو خطبات میں جگہ نہ دیتے۔اب پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ کوئی نئی بات لکھی گئی ہے کیونکہ قدیم مباحث سے لوگ واقف نہیں مغربی فلسفے نے اقبال مرحوم کو یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ انھوں نے خطبات میں کہیں لکھا ہے کہ اللہ نے اپنی آزادی طاقت حیات قدرت میں انسان کو شریک کر لیا ہے۔

He has chosen finite egoes to take part in his life power and freedom.

قرآن کے مطابق اللہ نے اپنے اختیارات میں کسی کو شریک نہیں رکھا۔حتی کہ پیغمبروں کو بھی نہیں البتہ اس نے کچھ اختیارات دنیا میں انسان کو دیے ہیں اور بتا دیا ہے کہ آخرت میں تمام اختیارات صرف اسی کے پاس ہوں گے کیونکہ وہ مالک یوم الدین ہوگا۔

اقبال مرحوم فطرت کے سائنسی مطالعے کو عبادت قرار دیتے ہیں لیکن افسوس کہ یہ عبادت آج تک کسی نیچری کسی سائنس دان کو عابد نہ بنا سکی۔تین سو سال میں ایک بھی عبقری فطرت کی عبادت کر کے فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔فطرت کے مناظر کا مشاہدہ تجربہ مطالعہ ذات خداوندی کا ادراک مہیا کرتا ہے۔جب کہ ذات خدا ناقابل ادراک ہے۔ذات کے بارے میں، پیغمبروں کو جو علم اللہ

تعالیٰ عطا فرماتے ہیں وہ ان کی مرضی ہے اور وہ اس علم سے اس حد تک واقف ہو سکتے ہیں جیسا کہ قصہ موسیٰ سے اشارات ملتے ہیں جب ذات خداوندی کی حقیقت اور ادراک کے فہم میں پیغمبروں کا یہ مقام ہے تو اس ارذل واسفل انسان کو اقبال مرحوم کہاں پہنچانا چاہتے ہیں۔ انسان ماہیت روح کا ادراک نہیں کر سکتا تو ذات الٰہی کا ادراک کیسے کرے گا۔ اللہ کا دیدار نہ چشم ظاہر سے ممکن ہے نہ چشم مخفی سے۔ اسی نظریے کو لے کر منکرین حدیث نے دعوی کیا کہ اصل علماء تو سائنس داں ہیں یہ عجیب علماء ہیں جنھیں خشیت الٰہی نصیب ہوتی ہے نہ قرب الٰہی نہ دیدار الٰہی صرف دعوے ہی دعوے ہیں۔ وہ عبادت کو ایک فرض روح کی پکار کے بجائے سماجی حرکت Social Activity بنا دیتے ہیں۔ ان کے پاس عبادت کی شکلوں کی بھی اہمیت نہیں قبلہ رو ہونے کا مقصد وحدت حرکات ہے۔ معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہوتا، اقبال مرحوم آگے بڑھ کر جنت و دوزخ کو حقیقت کے بجائے محض تصورات سمجھتے ہیں۔ نہ صرف اقبال مرحوم جنت و دوزخ کے طبعی وجود کا انکار کرتے ہیں بلکہ حیات بعد الموت کو بھی حقیقی واقعہ سمجھنے کے بجائے نفس انسانی کے عروج، وتبدل وعلو کا ایک راستہ قرار دیتے ہیں۔ مرنے کے بعد فیصلہ ہوگا کہ خودی کیسے ترقی کرے گی اور کتنی؟ اگر آخرت محض ادعا ارتقاء خودی کے لیے برپا کی جا رہی تھی تو کیا ضرورت تھی۔ افسوس کہ اس ضرورت کا علم چودہ سو برس میں کسی کو نہیں ہوا۔ اقبال مرحوم کے تصور جنت و دوزخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ تزکیۂ نفس کا ادارہ ہے جہاں سے نفوس کے تزکیہ کے بعد نفس انسانی کی لامحدود تخلیقی قوتیں آخری امکانات کی جستجو میں مصروف عمل ہو جائیں گی یعنی نطشے کا ابر ماش مرنے کے بعد بلکہ خود کو مارنے کے بعد جی اٹھے گا تو پھر وہی تخلیقیت کا سفر شروع کر دے گا کیونکہ جنت و دوزخ کی زندگی تو تخلیق کے لیے پیغام مرگ ہے ایک خاص علاقے میں محدود زندگی جبر ہے اور ارتقاء وتخلیق لامحدود تخلیقی قوتیں آخری امکانات کے تصور سے خالی ہے۔ یہ تصور حرکی نہیں ہے اور حرکت Dynamic اسلام کا اصل الاصول ع روح امم کی حیات کشمکش انقلاب چونکہ موت کے بعد کی دوزخی برزخی بہشتی زندگی اس کشمکش حیات سے خالی ہوگی۔ لہٰذا یہ زندگی خدا کی ہر لحہ تخلیق ہونے والی ہستی کی خود تخلیقیت کے تصور خلاقی کا انکار ہے لہٰذا خدا ایسا نہیں کر سکتا۔

اقبال مرحوم نہ صرف خدا کو بلکہ پیغمبر کو بھی صرف اور صرف تخلیقیت کے ذریعے پہچانتے ہیں اور دونوں ہستیوں کی اصلیت یہی ہے کہ دونوں تخلیقیت اور خلاقیت سے پُر ہستیاں ہیں۔ اس خالص مادی تصور سے خدا اور اس کے پیغمبروں کو صرف مادی مظاہر میں محصور کرنا اور ان کو محض مادیات کے دائرے سے سوچنا، دیکھنا اور پہچاننا اور اس سے اوپر نہ اٹھنا ہی ماڈرن ازم ہے۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ ری کنسٹرکشن آف اسلامک تھاٹ اسلامی معاشروں میں ماڈرن ازم کی انجیل ہے۔ غلط تو نہیں کہا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ اس کتاب پر آج تک بھرپور نقد نہیں کیا گیا۔ اب وقت ہے کہ اس کتاب میں مستور کفر الحاد، لادینیت کو بیان کر دیا جائے۔ کیونکہ اقبال مرحوم کی شاعری مسلم ہو چکی ہے اور ان کی نثر طاق نسیاں میں رکھ دی گئی ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اقبال مرحوم اب اس نثری حوالے سے بہت بلند ہو چکے ہیں۔ آخر عمر

میں اقبال مرحوم نے بھی ان نظریات سے رجوع کرلیا تھا۔ ہمارے دوست خواجہ عبدالوحید نے مجھے لاہور کی ایک تقریب کا حال لکھا تھا جہاں اقبال مرحوم نے یہ اعتراف کیا تھا کہ مغربی فکر وفلسفے کو منہاج سمجھ کر اسلام کی توجیہہ وتشریح کا طریقہ ٹھیک نہیں تھا۔ مجھے اس کے برعکس رویہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔یعنی آخری عمر میں اقبال مرحوم امام غزالیؒ کے منہاج کے قائل ہوگئے تھے کہ حق تو صرف اور صرف کتاب وسنت میں محصور ہے۔اس کو منہاج بنا کر مغربی فلسفے کا جائزہ لیا جائے۔خطبات کی خطرناک ترین غلطی مغربی فلاسفہ رمفکرین کے رسالت مآب پر اعتراضات ہیں جس میں کیفیات وحی کو نفسیاتی بیماری کی علامتیں قرار دیا گیا تھا۔اقبال مرحوم نے ان الزامات کی تردید کے بجائے اس الزام کو تسلیم کرلیا کہ نبیؐ نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوسکتے ہیں اور تاریخ کا رخ موڑنے والی شخصیات عموماً غیر معتدل ہوتی ہیں اس میں کوئی حرج نہیں، عہد حاضر میں اقبال مرحوم مذہب کی غایت اصلی Spritual Intution بتاتے ہیں جو باطل تصور ہے۔اقبال مرحوم کے خطبات کے مباحث کے نتیجے میں مذہب کا امکان محض فلسفیانہ واہمہ بن جاتا ہے۔فی الاصل مذہب کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور وجدان ہی روح کے تاروں کو چھیڑنے کے لیے کافی ہوتا ہے لہٰذا اقبال مرحوم کا تصور امکان مذہب محض انسانی انا self کی فلسفیانہ توجیہہ بن جاتا ہے۔جس کے نتیجے میں مذہب کالعدم ہوجاتا ہے جیسا کہ مغرب میں ہوچکا ہے۔میرا خیال ہے کہ خطبات کو جب بھی اسلامی معاشروں میں علمی مقام ملا مذہب اسلامی معاشروں سے رخصت ہوجائے گا۔

ذات خداوندی ترقی:تخلیقیت

خدا کی ذات فہم انسانی سے بالاتر ہے، اس کی اصلیت وحقیقت ہمارے قلب پر عیاں نہیں ہوسکتی، لہٰذا ہم ذات باری تعالیٰ کا تصور تو کرسکتے ہیں ادراک نہیں کرسکتے، لیکن اقبال مرحوم کو یقین تھا کہ ماڈرن سائنس کے ذریعے اللہ کی حقیقت کو پہچانا جاسکتا ہے۔ان کے خیال میں سائنس کے ذریعے ذات باری تعالیٰ کی حقیقت کا ادراک ہوسکتا ہے وہ اللہ کو صفت قرار دیتے ہیں جو مسلسل تخلیقیت میں اپنا اظہار کررہا ہے۔جبکہ اللہ کی ذات ایک ہے اور ننانوے اس کی صفات ہیں اس کا اسم خاص اللہ ہے۔اقبال مرحوم حرکت وارتقاء کے مغربی تصور سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ خدا کو محض تخلیقی قوت کے طور پر دیکھتے ہیں، اس تخلیقی عمل میں انسان خدا کا رشتہ دار بن جاتا ہے، ان کے خیال میں کیونکہ تخلیقی ذہن سائنٹفک میتھڈ رکھتا ہے اس لیے ماڈرن فزکس سے اللہ کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔خدا کا نقطہ نظر تخلیقیت ہے یا نہیں یہ اقبال مرحوم کو کیسے معلوم ہوا وہ خدا کے اس نقطۂ نظر تک کیسے پہنچے؟ یہ تو نبوت کا دعویٰ ہے۔اللہ پیغمبر کو خود بتاتا ہے کہ اس کی رضا اور منشاء کیا ہے۔سائنس کے ذریعے خدا کی منشاء اور اس کی قوت تخلیقیت کا ادراک محض فلسفیانہ موشگافیاں ہیں اقبال مرحوم مادی کائنات کو روحانی شے اور روحانی حقیقت سمجھتے ہیں، ان کے خیال میں فزیکل لاز اور مسٹیکل لاز دونوں کا علم [نالج] ایک دوسرے کا مددگار ہے۔خالق اور تخلیق میں کوئی فرق نہیں، وجود ایک ہی

ہے اس وجود کا اظہار مادہ ہے لیکن اس کی فطرت [نیچر] تبدیل ہو رہی ہے خود مادہ کیا ہے؟ سائنس آج تک یہ نہیں بتا سکی کہ مادہ کیا شے ہے؟

حقیقت ماورائے ذات نہیں ہے:

ترقی اور ارتقاء کے مغربی نظریات میں اصل بات لمحہ بہ لمحہ مادی ترقی ہے جو نگاہوں کو چکا چوند کر دے۔ انسان آزاد ہے اور ارتقاء پذیر ہے تو اس کے ہونے کے امکانات لامحدود ہیں لہٰذا مقصد کا کیا سوال بس ترقی کرنا، تخلیق کرنا، حرکت کرنا، ایجاد کرنا، مادی مظاہر میں وسعت اختیار کرنا نو بہ نو ایجادات بازار میں پیش کرنا، لذات دنیا سے زیادہ سے زیادہ متمع ہونا، ایجادات کا اور کیا مقصد ہے، یہی تو مقصد زندگی ہے۔ برگساں اور اقبال مرحوم کے یہاں انسان کی لامحدود صلاحیتوں کی وسعت کے امکانات خودی کے جذبے کے ذریعے دریافت ہوتے رہتے ہیں۔ فلسفہ خودی ..... میں اور میری ذات کہ اسرارِ حقیقت مجھ میں مضمر ہیں لہٰذا حقیقت ماورائے ذات نہیں رہتی۔ انسان بے پناہ امکانات کا امین بن جاتا ہے، وہ ترقی کرتا چلا جائے، آگے بڑھتا جائے، اس کا کام ترقی پانے کے سوا کچھ نہیں ہے، یہی حاصل زندگی ہے۔

انسان کی دسترس سے لوح محفوظ بھی محفوظ نہیں:

خودی کے ذریعے حرکت اور تخلیقیت ہی حق بن جاتے ہیں، انسان ہی وراء الورا ہو جاتا ہے اور خدا بھی بندے سے اس کی رضا پوچھنے کے لیے عرش سے فرش پر اتر آتا ہے۔ یہ خودی بحر بے کنار ہے، اس کے بغیر انسان کائنات انقلاب ارتقاء، سائنسی ترقی کا وجود بے معنی ہے، تقلید کے جمود سے نکلنے کے لیے اقبال مرحوم نے حرکت کا ایک ایسا تصور اختیار کر لیا جو صحف سماوی کی تاریخ میں اور مذہبی تہذیبوں کی تاریخ میں خالصتاً اجنبی تصور ہے، اس تصور کے ذریعے یہ تصور بھی نکلتا ہے کہ تقدیر کا کوئی اور کاتب نہیں ہے۔ انسان خود کاتب تقدیر ہے، جس کی دسترس سے لوح محفوظ بھی محفوظ نہیں۔ دنیا بڑھ رہی ہے، خدا اپنے آپ کو تخلیق کر رہا ہے، نئی دنیائیں طلوع ہو رہی ہیں، تعمیر خودی کا طریقہ قومی بالادستی ہے، انسان مر جائے گا، قوم زندہ رہے گی، ابدیت قوم کو حاصل ہے، مسلم قوم پرستی اسی تصور سے جڑ پکڑتی ہے، قرآن وسنت مسلم قوم پرستی کے تصور سے خالی ہیں۔

مغرب اور نطشے کی ہم آہنگی:

اقبال مرحوم یہ بھی کہتے ہیں کہ وجدان عقلیت کی اعلیٰ ترین منزل ہے اور سائنٹفک میتھڈ کے ذریعے حقیقت Truth کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مغرب وجدان [Highler Facutuly] کو اعلیٰ ذریعہ علم نہیں سمجھتا، وجدانیت کی سائنٹفک میتھڈ میں کوئی جگہ نہیں۔ اقبال مرحوم ایک تہذیب کی تاریخ کو دوسری تہذیب کی تاریخ میں ضم کرنا چاہتے ہیں جو ممکن نہیں۔ مغرب وجدان اور جبلت میں فرق کرتا ہے اور مغربی فلسفہ جبلتوں کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ نطشے کو پاگل قرار دے کر قید کیا گیا، اب پورا مغرب پاگل ہو گیا ہے کیونکہ جدید مغرب نے نطشے کے فلسفے کو اختیار کر لیا ہے، جمالیات اور جبلتیں ہی حقیقت مطلقہ کا متبادل

ہیں۔ پاگل پن کی انتہا یہ ہے کہ مغرب کی نظر میں ہر وہ شخص جاہل غیر عقلی، وحشی اور دائرہ انسانیت سے خارج ہے جو مسائل کا حل مذہب، الہامی متن کسی روایت یا کسی خارجی ذریعے میں ڈھونڈتا ہے، لہٰذا ایسا انسان مغربی انسان کی تعریف کے پیمانے پر پورا نہیں اترتا اور واجب القتل ہے، اسی فلسفہ کے تحت یورپ اور امریکہ نے کروڑوں انسانوں اور سرخ ہندیوں کا قتل عام کیا، براعظم ایشیا، افریقہ، عرب، آسٹریلیا لوٹ لیے۔

اقبال مرحوم اور کانٹ: دوامی امور ہنگامی امور

ماڈرن ازم کے آغاز میں مغرب کا دعویٰ تھا کہ حقیقت پہچاننے کے لیے انسان خود کفیل ہے۔ اسے وہ صلاحیتیں حاصل ہیں جس سے وہ حقیقت مطلقہ [absolute reality] تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ اقبال مرحوم اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ جب کہ کانٹ اس دعوے کی تردید کرتا ہے جو مغرب کا سب سے بڑا فلسفی اور ماڈرن ازم کا بنیادی فلسفی ہے۔ کیا اقبال مرحوم کانٹ سے بڑے فلسفی تھے اور مغرب کو مغرب سے زیادہ بہتر جانتے تھے یا مغربی فلسفے پر کانٹ سے زیادہ عبور رکھتے تھے؟ جس دعوے کا انکار کانٹ نے اس کے بعد تمام مغرب نے کیا۔ اقبال مرحوم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کانٹ نے ثابت کر دیا کہ دوامی امور کا علم یعنی حقیقت مطلقہ تک رسائی ممکن نہیں۔ انسان صرف ہنگامی امور کا علم حاصل کرسکتا ہے یعنی انسان علوم نقلیہ کا اثبات یا تردید سائنس سے حواس سے تجربات سے نہیں کرسکتا۔ کیونکہ یہ انسان کے دائرہ حواس و تجربات سے ماورا ہیں۔ صرف علوم عقلیہ کی تائید یا تردید کی جاسکتی ہے اور یہی اصل علم ہے بعض مغربی فلسفیوں اور سائنس دانوں کی زبان میں جس علم کو ریاضی کی زبان میں یعنی دو اور دو چار کی طرح بیان نہ کیا جاسکے وہ علم ہی نہیں ہے جب کہ سائنس کے بے شمار نظریات مفروضات پر قائم ہیں۔ انھیں بھی دو اور دو چار کی طرح بیان نہیں کیا جاسکتا۔ سائنس آج تک مادہ کی تعریف بیان نہیں کرسکی کہ یہ ہے کیا۔ اگر عقل، فلسفہ اور سائنس کے ذریعے حقیقت مطلقہ تک رسائی حاصل ہوسکتی تو فلسفہ کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ میں آج تک کسی ایک فلسفی سائنس دان کو حتیٰ کہ ارسطو کو حقیقت مطلقہ تک رسائی کیوں حاصل نہ ہوسکی؟ اگر بالفرض کسی کو آج رسائی حاصل بھی ہوجائے تو اصلاً یہ عقل کا کمال ہوگا اور یہ عقل اس فرد واحد کی ہوگی اور حقیقت مطلقہ کی تائید و توثیق ایک شخص کی عقل کرے گی یعنی حقیقت مطلقہ محتاج ہے، اپنی مخلوق کی تصدیق کی، یعنی اصل حقیقت مطلقہ تو عقل انسانی ہوئی۔ اقبال مرحوم کے خطبات میں حقیقت مطلقہ خود انسان، انسان کی عقل اور سائنس بن جاتی ہے یعنی حقیقت پیدا کی جارہی ہے، تخیل اور تصور اور تجربے کے ذریعے یا ان ذرائع سے اس کی تصدیق کی جارہی ہے جب کہ حقیقت قائم بالذات ہوتی ہے نہ یہ تخلیق ہوتی ہے نہ فناء ہوتی ہے، کوئی اسے مانے یا نہ مانے وہ حقیقت ہوتی ہے۔

مسلم ماڈرن ازم: مسلم لبرل ازم

ان تمام حقائق کے باوجود ہمیں مسلم ماڈرن ازم اور مسلم لبرل ازم میں فرق کرنا چاہیے۔ مسلم

ماڈرنسٹ نہایت مخلص، دین کے خادم، نیک نیت امت کے لیے پریشان لوگوں کا گروہ ہے۔اس کے سرخیل اقبال مرحوم ہیں یہ معجزات کو بھی مانتے ہیں، اسلام کے ماخذات پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ یہ مسلم جدیدیت پسند مغرب میں ایک روحانی خلاء محسوس کرتے ہیں، اس کی مادیت کو سراسر اسلام کا حاصل اور ثمر سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مغرب ناکافی ہے کیونکہ اس نے اسلام سے علوم عقلیہ، سائنس، تجربیت اور دنیا لے کر ترقی کر لی۔مگر اسلام کی مکمل تعلیم یعنی روحانیت سے استفادہ نہ کیا، مغرب کے مقاصد درست ہیں لیکن اس کی تکمیل اسلام کے نظام عبادات و روحانیات کے بغیر نہیں ہوسکتی، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔مغرب کے فلسفے سے اتنے متاثر ہیں کہ اسے بھی اسلام میں یا اسلام کو مغرب میں سمونا چاہتے ہیں۔مسلم لبرل ازم دوسری شے ہے، جس کی ابتداء کرامت جونپوری، چراغ علی، سرسید نے کی اور مشرقی، نیاز فتح پوری، عبدہٗ، جیراج پوری، غلام احمد پرویز اس کی علامتیں ہیں۔ یہ نہایت بدنیت اور امت کے مخالف لوگ ہیں، یہ لوگ فکری اور علمی سطح پر نہایت کمزور ہیں۔سرسید، عبدہٗ تو انگریزی بھی نہیں جانتے تھے۔

سرسید چراغ علی: قرآن کلام اللہ نہیں

سرسید اور مولوی چراغ علی تو قرآن کو اللہ کا کلام ہی نہیں مانتے۔ جب یہ قرآن کو کلام الٰہی نہیں مانتے تو ان کا دین کیا رہ گیا، ان کے بارے میں حسن ظن سے کتنا کام لیا جائے یہ تو سراسر الحاد ہے اور کیا ہے؟ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ [مولانا اشرف علیؒ تھانوی] اور حضرت نانوتویؒ نے [تصفیہ العقائد میں] سرسید کے بارے میں نقد کے ساتھ کچھ کلمات خیر کہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے سامنے سرسید کی تمام چیزیں نہیں تھیں جو قرآن کو کلام اللہ نہ مانے اس کے بارے میں کیا حسن ظن رکھا جائے جس کی زندگی انگریزوں اور ماڈرن ازم کی تبلیغ میں بسر ہوئی، اس کا امت پر کیا احسان ہے صرف نوکریاں، غلامی کے طریق۔لہٰذا مسلم معاشروں کو مسلم لبرل ازم سے کوئی خطرہ نہیں، اصل خطرہ مسلم ماڈرن ازم سے ہے، یہ کبھی بھی طاقتور تحریک بن سکتا ہے اس میں مخفی صلاحیتیں موجود ہیں۔

خطبات اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ

مولانا مودودیؒ نے مسئلہ قومیت اور اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی لکھ کر دراصل مسلم ماڈرن ازم کے کلیدی دعوؤں پر ضرب لگائی تھی، بلکہ میرا خیال ہے کہ اسلامی تہذیب ومبادی اقبال مرحوم کے خطبات کا ایک سطح پر جواب بھی ہے۔خطبات اقبال دراصل مسلم جدیدیت کی بائبل ہے، لیکن اتنی ادق اور عسیر الفہم ہے کہ منکرین حدیث اس سے جزوی استفادہ بھی نہ کر سکے کیونکہ وہ فلسفیانہ مباحث سے استفادہ کی اہلیت نہیں رکھتے، ورنہ اگر منکرین حدیث اپنے خاص موثر اسلوب میں زندگی بھر صرف خطبات اقبال مرحوم کی تشریح لکھ دیتے تو لاکھوں مسلمانوں کا ایمان متزلزل کر دیتے فلسفہ کو پڑھنے اور سمجھنے کی روایت ہند میں بہت کمزور ہے۔ خیر آبادی مکتب فکر نے بھی کبھی مغربی فلسفہ کو نہیں پڑھا، جدید تعلیمی اداروں میں فلسفے کی روایت بھی کمزور ہے علی گڑھ وغیرہ سے مغربی فلسفے پر کیا کام ہوا صفر بلکہ مغرب کی تائید وتوثیق ہوئی ہے۔

مغرب پر کوئی نقد نہیں، پورا عالم اسلام اس معاملے میں بانجھ ہے۔ ندوہ اور دارالمصنفین بھی از ہر بھی، دیو بند بھی جماعت اسلامی بھی، یہی حال جدید تعلیم یافتہ طبقات کا ہے۔ اگر جدیدیت پسند طبقات میں سے ایک بھی خطبات کو اوڑھنا بچھونا بنالیتا تو اس تحریک کو روکنا مشکل تھا، مجھے اندیشہ ہے کہ مستقبل میں برعظیم کے مذہبی معاشروں کو تہس نہس کرنے کے لیے خطبات اقبال کو ایک طاقت ور قوت کے طور پر کام میں لایا جائے گا۔ اور اقبال مرحوم کی محبوب دلنواز ہستی کے اس گمشدہ فراموش کردہ نثری گوشے کے ذریعے اسلام کے حصار میں خلل پیدا کر دیا جائے گا۔ مولانا مودودیؒ کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اقبال مرحوم کے پیدا کردہ مسلم ماڈرن ازم کے مکتب فکر کی یلغار کو روکا اور اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور تحریکی دعوت کے ذریعے انگریزی خواں طبقات میں مسلم جدیدیت پسندی کی تحریک کا قلع قمع کر دیا، ان کی خامیاں اور کمزوریاں اپنی جگہ ہیں انبیاء کے سوا کون خامیوں سے مبرا ہے۔ میں نے معارف میں ان کے فکر کا سخت محاکمہ کیا ہے اور ان کی غلطیوں پر بار بار گرفت کی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اقبال مرحوم کی نثر کے منفی اثرات کو جدید تعلیم گاہوں میں مولانا مودودی کی کتابوں نے زائل کر دیا بلکہ سنا ہے کہ جماعت کے یہاں اہل علم خطبات کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں۔

جو کام علماء نہ کر سکے وہ کام اقبال مرحوم نے انجام دیا:

اقبال مرحوم پر تمام تر نقد کے باوجود ان کے کارناموں کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ ہم نے کیا پوری امت نے اقبال مرحوم کی لغزشوں اور خطاؤں کے عظیم مجموعے خطبات کو بھلا دیا اور ان کے خیر مسلسل کلام اقبال مرحوم کو روح میں بسا لیا۔ اقبال مرحوم کا یہ کم کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو کو فاسقوں و فاجروں سے چھین کر اسے ایسی مذہبی شناخت عطا کر دی جس کی مثال پوری تاریخ میں نہیں ملتی، دنیا کی کسی زبان میں اتنا بڑا شاعر پیدا نہیں ہوا جس نے لوگوں کی سمت سفر موڑ دی اور زبان کو تہذیبی و تمدنی سطح کا اعلیٰ ترین ترجمان بنا دیا ہو، غلطیاں اپنی جگہ اس سے ان کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ آخرت میں فیصلہ میزان کے ذریعے ہوگا۔ وہاں نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا یا برائیوں کا۔ مجھے یقین ہے کہ اقبال مرحوم کا نیکیوں کا پلڑا سب سے بھاری ہوگا۔ اقبال مرحوم نے ایسے ایسے مسلمانوں کے دل میں دین کی محبت جگا دی اور انھیں سچا مسلمان بنا دیا جنھیں علماء بھی تبدیل نہیں کر سکے۔ لیکن کلام اقبال مرحوم نے ان کی زندگی بدل دی جس نے ایک ملحد کو مسلمان بنا دیا وہ کتنا بڑا شخص ہوگا جس نے لاکھوں کو اسلام کی محبت میں مبتلا کر دیا اس کے درجات کا کیا کہنا۔

اقبال پر بلنٹ، افغانی، چرغ علی، سعید پاشا، گوکلپ، قادر مغربی، اغنی دیس، پادری رجب علی، پادری میکال کے اثرات:

بلنٹ نے اپنی کتاب Future of Islam، ۱۸۸۲ء میں لکھا تھا کہ اسلام حرکت و ترقی کا مذہب ہے یہی نظریہ اقبال مرحوم نے بلنٹ سے اخذ کر کے وسیع کر دیا۔ بلنٹ افغانی اقبال مرحوم اصلاح کلیسائے یورپ

کی تحریک سے شدید متاثر تھے اور اسلام میں اصلاح کے لیے کسی لوتھر کا راستہ دیکھ رہے تھے۔ اقبال مرحوم کو لوتھر کے منفی اثرات کا بخوبی اندازہ تھا جس کا ذکر ایک خطبے میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ بلنٹ کی کتاب میں اصلاح خلافت کی تجاویز کے خلاف میں نے معارف کی جلد ۸، ۹، ۱۲ میں کئی مضامین شائع کیے۔ بلنٹ نے اجتہاد پر بہت زور دیا اقبال مرحوم اس سے شدید متاثر تھے یہ وہی بلنٹ ہے جس سے افغانی کے خصوصی تعلقات تھے اور سلطت برطانیہ کے درمیان یہ رابطہ کا کام کرتے تھے۔ صرف بلنٹ سے نہیں بلکہ ان کی اہلیہ سے بھی افغانی کے تعلقات گھر والوں کی طرح تھے۔ افغانی دنیا میں جہاں کہیں ہوتے بلنٹ سے ان کا رابطہ استوار رہتا، بلنٹ اور ان کی اہلیہ کے اصرار سے افغانی انکار نہ کر سکتے تھے۔ برطانوی حکومت اور امیر ترکی کے مابین روابط بھی بلنٹ کے ذریعے طے پائے، مشکل وقت میں بلنٹ نے افغانی کی مالی اور سفارتی مدد بھی کی، ترکی میں اثر ورسوخ کا سبب بھی یہی مراسم تھے۔ افغانی اسلام کو ترقی، فلاح، علم، سائنس، اور انسانیت کا محرک سمجھتے تھے۔ اس تحرک کی علامتیں اسلامی تاریخ کے بجائے وہ مغربی تاریخ سے ڈھونڈتے تھے اور مغرب کی تاریخ کو اسلامی تاریخ کی ہی توسیع شدہ، بہترین شکل خیال کرتے تھے، کم وبیش یہی افکار اقبال مرحوم کے تھے کیونکہ وہ افغانی سے بھی متاثر تھے۔ علی عبدالرازق کی کتاب اسلام واصول الحکم کا اقبال مرحوم پر خاص اثر تھا۔ اس کے بڑے مداح تھے، رازق نے مغرب کو معیار بنا کر فقہ اسلامی پر بحث کی تھی۔ اقبال مرحوم اسی اصول کو اہم سمجھتے تھے اور غالباً کہیں انھوں نے لکھا ہے کہ جو اس اصول کے تحت فقہ مرتب کر دے وہ مجدد حاضر ہوگا۔ اقبال مرحوم پر مولوی چراغ علی کی کتاب ریفارمز انڈر مسلم رول کا بھی بہت اثر تھا۔ وہ بھی اجتہادات کے داعی تھے۔ تقلید، جمود، اجتہاد، ارتقاء، اصول حرکت اور مذہب کی اصلاح جیسے خوبصورت نظریے افغانی بلنٹ اور اقبال مرحوم کے یہاں یکساں طور پر در آئے اور اس فکر کی عملی علامت لوتھر کی ذات تھی جس نے عیسائیت کو تباہ کر دیا، اجتماعی اجتہاد اسمبلیوں کے ذریعے ممکن بنانے کا نظریہ شیخ عبدالقادر مغربی نے پیش کیا تھا۔ اقبال مرحوم ان سے شدید متاثر تھے اور اس سلسلے میں مجھ سے گفتگو کر چکے تھے۔ سرسید اجتہاد کو اصلاح مذہب کا متبادل ومترادف گردانتے تھے۔ اجتہاد سے ان کی مراد دینی اصطلاح نہیں بلکہ الحاد تھا، یعنی مغرب کے راستے میں دین کا جو حکم رکاوٹ بنے اس کی تاویل کر کے بدل دیا جائے۔ اسے دین سے خارج کر دو، بے چارے نہ انگریزی جانتے تھے نہ علوم اسلام پر عبور رکھتے تھے۔ قرآن کو کلام رسول اللہ مانتے تھے، حالانکہ کفار نے بھی اسے کلام خداوندی مانا ہے، یہ کفر کی حمایت میں کفر سے بھی بڑھ گئے تھے اور پیروی مغرب کو عام کرنے میں تقلید کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔

سعید حلیم پاشا نے طبعی قانون کو میکانکی قرار دیا۔ اقبال مرحوم اس میکانکی تصور قانون سے بھی متاثر تھے۔ ضیا گوکلپ کے افکار وشاعری کا بھی اقبال مرحوم پر شدید اثر رہا۔ ترکی میں شریعت کے جمود اور غیر حرکت پذیری کا تصور شدت سے ابھرا تو یونانی الاصل ترکی، اغنی دلیس نے [N.P Aghnides] نے ثابت کیا کہ اسلامی قانون بے لچک ہے اور جمود کی طرف لے جاتا ہے۔ لہٰذا اسے حرکی قانون تصور کرنا غلط

ہے۔اغنی دیس سے پہلے بالکل یہی نقطہ نظر پادری رجب علی نے ۱۸۸۰ء میں پیش کیا تھا کہ اسلام ایک جامد مذہب ہے۔ یہ آسمانی سلطنت ہے لہٰذا تمام احکام آسمانی میں تبدیلی ممکن نہیں لہٰذا اس جامد مذہب کے ساتھ مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔اگر ترقی چاہتے ہیں تو مذہب چھوڑ دیں۔یہی بات پادری میکال نے اپنے مضمون میں اسی زمانے میں لکھی کہ مسلمان اسلام کو چھوڑے بغیر ترقی نہیں کر سکتے۔اسلام میں لچک نہیں تمام قوانین الٰہی ہیں، ان کے ماخذات قرآن وسنت ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہوسکتی لہٰذا یہ مذہب زمانے کے ساتھ چل نہیں سکتا۔اس کے جواب میں ہمارے پادری مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب ریفارمز اینڈ مسلم رول کے نام لکھی جس کا ترجمہ مولوی عبدالحق نے اعظم الکلام کے نام سے کیا ہے۔یہ کتاب ملکہ برطانیہ کا قصیدہ بھی ہے اور اس میں الحادی اجتہادات کا انبار ہے تاکہ دین اسلام کو نہایت لچکدار زمانے کے عین مطابق ثابت کیا جائے۔سب سے بڑا اجتہاد یہ کیا کہ قرآن کو کلام رسول اللہ ثابت کر دیا۔اقبال مرحوم اس کتاب سے بہت متاثر تھے۔خطبہ اجتہاد پر اس کتاب کے بہت اثرات ہیں۔اقبال مرحوم نے چراغ علی کا حوالہ اس لیے نہیں دیا کہ ہندوستان میں چراغ علی کے بارے میں کسی کی رائے اچھی نہیں تھی اور اعظم الکلام کی اشاعت کے بعد تمام علماء چراغ علی کے خیالات سے بخوبی واقف ہوگئے تھے۔خطبہ اجتہاد اور اس کتاب کی روح بنیادی طور پر یکساں ہے، خود نہ بدلو دین کو بدل دو، جو چیز عقل میں نہ آئے وہ اسلام نہیں اسلام عقل ہے اور عقل اسلام ہے، سائنس اسلام ہے اسلام سائنس خطبات میں اس کے سوا کیا ہے؟ اغنی دیس نے اسلام کو جامد مذہب ثابت کرنے کا فلسفہ اپنے مقالے ''محمڈن تھیوریز آف فنانس'' میں پیش کیا۔اس کا جواب خطبہ اجتہاد میں حرکت کے نظریے کے ذریعے دینے کی کوشش کی گئی۔لہٰذا انھوں نے اغنی دیس کے نقد کا ارادہ کیا۔اقبال مرحوم چاہتے تھے کہ مجتہد فی الشرع، مجتہد مستقل اور مجتہد مطلق کا وجود اسلامی معاشرے میں ضروری ہے تاکہ اجتہاد ہو لیکن اس اجتہاد کے لیے جس ٹھوس علمی پس منظر، تقویٰ، عصر سے واقفیت وغیرہ ضروری تھی اس سے وہ دل برداشتہ ہوتے تھے۔ دنیائے اسلام میں تقلید کے اثر سے رہائی کی تحریکیں امام ابن تیمیہؒ، محمد بن عبدالوہابؒ عثمان، دان فودیو، شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسماعیلؒ کے ذریعے اٹھیں۔لیکن اس سے فروغ اجتہاد نہ ہوا بلکہ کچھ نئے مسائل پیدا ہوگئے۔اقبال مرحوم کی ان مسائل پر نظر نہ تھی وہ اخلاص کے ساتھ انہی تحریکوں کو ایک نئی ساخت دینا چاہتے تھے، لیکن اس دینی بصیرت سے محروم تھے، جو اسلامی علوم میں ضروری تھی۔مغربی علوم میں ان کی اچھی نظر تھی۔لہٰذا وہ ان علوم سے شدید متاثر ہوگئے۔وہ تلفیق دین کے ذریعے اجتہاد کے حامی تھے، مگر اس راستے کی دشواریوں سے آگاہ نہ تھے اور نہ ہی اسلامی تاریخ وفقہ پر ان کی ویسی نظر تھی کہ تلفیق کے مراحل طے کر سکتے۔یا انھیں بخوبی سمجھ سکتے۔اجتہاد ۹ویں صدی ہجری تک ہوتا رہا ہے۔بلکہ اس کے بعد بھی ہو رہا ہے یہ کہنا کہ اجتہاد ختم ہوگیا ہے یہ بھی علوم اسلامی کی تاریخ سے ناواقفیت ہے، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ علماء جنھوں نے کہا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے یہ بات علماء کی جانب سے انہی معنوں میں کہی گئی جن معنوں میں اقبال مرحوم نے اجتہاد کی مخالفت کرتے ہوئے جاوید نامہ میں تقلید پر زور

دیا۔ اقبال مرحوم یہ بات نہ سمجھ سکے کہ ابن تیمیہؒ و دیگر نے اگر تقلید کی مخالفت کی تو اس کا مقصد ماضی کا انکار، ماخذات دین کی نئی تعبیر وتشریح، فکر اسلامی کی تشکیل نو، ماخذات دین کا انکار نہیں تھا بلکہ ماضی کی طرف بالکل صحیح طریقے سے لوٹنا اور دین کو خالص کر کے عہد رسالت کی بازیافت کرنا تھا۔ اس میں دنیا کی لذتیں، حرص و طمع ترقی، سائنس، ٹیکنالوجی اور خواہش دنیا تو کم از کم شامل نہ تھی لیکن افغانی سرسید عبدہٗ کے نزدیک تقلید کی مخالفت اس لیے ضروری تھی کہ یہ مغربی اقوام سے حاصل ہونے والے منافع میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ تقلید جدید طرز زندگی اس کے سائنسی مظاہر سے بلا روک ٹوک استفادے میں سنگ گراں تھی۔ یہ تقلید اسلام اور مغرب میں واضح فرق محسوس کرتی تھی۔ یہ دارالحرب دارالاسلام کی اصطلاحات میں گفتگو کرتی تھی۔ یہ مغرب سے آنے والی ہر چیز کو مباح نہیں سمجھتی تھی اور اس کا نہایت باریک بینی، نکتہ چینی کے ساتھ جائزہ لیتی تھی۔ اقبال مرحوم کا خطبہ اجتہاد اور ان کے خطبات کیا قرون اولیٰ کے عہد کو تازہ کرنا چاہتے ہیں یا ان کی نظر اسلامی تہذیب وتمدن، بیت الحمراء کے محلات، باغات اور اندلس کے کتب خانوں میں ڈھونڈتی ہے اور مغرب کی معمل گاہوں میں وہ روحانیت تلاش کرتے ہیں یعنی سارا زور تو مادیت پر ہے وہ جن لوگوں کے اجتہاد سے اپنے اجتہاد کا استدلال فرما رہے ہیں مثلاً ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ، شاہ اسماعیل شہید ان میں سے کسی ایک کی بھی نگاہ اس دنیا، اور مادہ پرستی پر نہیں تھی۔ یہ مادیت تو ان کے اجتہادات سے خارج رہی۔ ان کی نظر میں تو قرن اول ہی مقصود اور محبوب تھا۔ اقبال مرحوم کے اجتہاد اور ان اکابرین کے اجتہاد میں یہ بنیادی فرق ہے۔ ان کا مرجع سابقون الاولون تھے اور سرسید، مصطفیٰ کمال، عبدہٗ افغانی کا مرجع مغرب، سائنس، مادہ پرستی، دنیا آرام و آسائش ترقی تھے لہٰذا دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا، اقبال مرحوم یہ فرق بھی نہیں سمجھ سکے۔ تقلید تاتاری یلغار کے بعد امت کو علمی وفکری یلغار سے بچانے کے لیے حصار مہیا کرتی تھی۔ استاذ مرحوم مولانا شبلیؒ کو لوگ معتزلی کہتے ہیں وہ پکے حنفی تھے کئی بار میں نے کریدنے کے لیے تقلید پر اعتراض کیے۔ استاد مرحوم مولانا شبلیؒ نے جو جوابات دیے وہ حیران کن تھے۔ انھوں نے کہا کہ معتزلہ کی طرف عقلی میلان کے باوجود میرا قلبی اور روحانی میلان احناف کی تقلید کو تسلیم کرتا ہے۔ کیونکہ یہ بند ایک بار ٹوٹ گیا تو کچھ نہیں بچے گا اور اجتہاد کے نام پر الحاد کے دروازے، چوپٹ کھل جائیں گے، اس لیے اجتہاد وہی معتبر ہے جو تقلید کے حصار میں رہ کر کیا جائے۔ یہ جو آج کل تقلید کو جمود عقل دشمنی، رجعت پسندی، جہالت کہا جاتا ہے۔ اس میں قصور دونوں کا ہے، یعنی ہمارا طبقہ مولوی جو اب علم سے کم بہرہ رکھتا ہے اور دوسری جانب مغرب کو جاننے والے جو صرف مغرب کو جانتے ہیں بلکہ یہ بھی مغرب کو کامل طور پر نہیں جانتے اور انھیں اسلام حقیر نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس جلیل القدر علماء آج تعداد میں کم ہیں لیکن وہ اسلام کو مکمل جانتے ہیں۔ سرسید کو دیکھیے کیسی کیسی باتیں لکھتے ہیں۔ لندن کی خادمہ انھیں ہندوستان کی اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی بیٹی سے بہتر نظر آتی ہے۔ ایسے لوگ اجتہاد کریں گے تو کیا کریں گے۔ مولوی نذیر احمد نے اسی لیے سرسید کی تفسیر پر سخت تبصرہ کیا ہے، ابن الوقت میں سرسید کے بارے میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔

اقبال پر نطشے، الگزینڈر، میکنزی، برگساں، ولیم جیمز، وارڈ، سورلے مکٹیگرٹ کے اثرات:

اقبال مرحوم کے یہاں روحانی وجدان اور سائنس کے ذریعے روحانیت کی منزل حاصل کرنے کا نسخہ ان تین مغربی فلسفیوں کا فیضان ہے جو کیمبرج میں پڑھاتے تھے۔ وارڈ، سورلے اور مکیٹگرٹ یہ فلسفے کے شعبہ سے وابستہ تھے۔ یہ تینوں کائنات کا روحانی زاویہ واضح کرتے تھے ولیم جیمز کی کتاب کے اثرات تو خطبات اقبال مرحوم میں جگہ جگہ محسوس ہوتے ہیں اقبال اس فلسفے کے اثر سے موت برزخ حشر نشر کو حیاتیاتی [Biological] اصطلاحات سمجھتے تھے۔ اقبال نطشے، برگساں انگریز فلسفی، الگزینڈر اور پروفیسر میکنزی سے بھی شدید متاثر تھے۔ الگزینڈر کے خطبات گلاسگو اور میکنزی کی انٹروڈکشن ٹو سوشل فلاسفی سے متاثر ہوکر اقبال مرحوم نے انسان کامل اور خاص قسم کے پیغمبر کی ضرورت کا فلسفہ اختیار کرلیا تھا۔ اس کے خیال میں زندگی حاضر کو اتنی ترقی دی جائے کہ یہ دنیا ہمارے بلند ترین عزائم کو پورا کرنے کی جلوہ گاہ بن جائے۔ اقبال کا انسان کامل نطشے، الگزینڈر، میکنزی کے افکار کا آمیزہ ہے۔ مغرب کے فلاسفہ سے بے حد متاثر تھے۔ اس کی تصدیق کے لیے اسرار خودی انگریزی کا دیباچہ دیکھا جائے جو نکلسن نے لکھا ہے۔ اس کا ایک حصہ اقبال مرحوم کے خیالات پر مشتمل ہے جو اقبال مرحوم نے خود بیان کیے۔ اقبال مرحوم سمجھتے تھے کہ دنیا کی مختلف قوموں کے فلسفے کے خیالات میں بے حد مشابہت ہے۔ مغربی فلسفہ اور اسلام میں بھی اس مشابہت کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ حق تو ہر جگہ ہے اور دنیا کے ہر فلسفے میں اس کا یکساں طور پر ظہور ہوا ہے۔ وہ اس سلسلے میں ایک کتاب لکھنے کا بھی منصوبہ ذہن میں رکھتے تھے۔ کتابیں تو بہت ان کے ذہن میں تھی جیسے تمہید القرآن، Islam as I understand وغیرہ حیرت کی بات یہ تھی وہ خود فلسفے اور لٹریچر کے دلدادہ تھے لیکن مسلمانوں کے لیے دونوں کی تعلیم کو بالکل بے کار سمجھتے تھے اور اس کی مذمت کرتے تھے۔ نکلسن کا دیباچہ مغربی فلسفے سے اقبال کی مرعوبیت کا شہ پارہ ہے۔ صرف ایک جملہ میں وہ بتاتے ہیں Life is an endeavour of freedom یہ خالص مغربی تصور ہے۔ آزادی کے اس کافرانہ تصور کی بنیادیں سترہویں صدی کی تحریک نشاۃ ثانیہ سے برآمد ہوئیں۔ اس سے پہلے کی تاریخ آزادی کے اس ملحدانہ تصور سے یکسر خالی ہے۔ مغرب آزادی کا قائل ہے۔ اسلام اس کی نفی کر کے عبدیت کا اعلان کرتا ہے۔ عبدیت اور آزادی توام نہیں ہوسکتے۔ عبد اور آزاد ہوجائے ممکن نہیں۔ مغرب نے روحانیت سے مادیت کا سفر تیزی سے طے کیا جب اس سے روحانی تشفی نہ ہوئی تو مادی روحانیت کا ذریعہ ایجاد کیا گیا ایک زمانے میں یورپ روحانی انجمنوں سے بھر گیا تھا جگہ جگہ ایسے ادارے انجمنیں تنظیمیں بن گئیں جو روحانیت کا دعویٰ کرتے۔ فرانس اس معاملے میں سب سے آگے تھے۔ یہودیوں نے قبالہ کے نام پر اور عیسائیوں نے روحوں سے کلام کے لیے بے شمار روحانی انجمنیں قائم کی تھیں۔ یہ سب مادی روحانیت کے مظاہر تھے اقبال مرحوم نے ان سے استفادہ کیا اور خطبات کی سطور میں اس روحانیت کو سمو دیا لیکن اسلامی منہاج میں اس کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے اقبال مرحوم کو اس کا بخوبی اندازہ تھا اور آخر زمانے میں تو بہت

شدت سے ہو رہا تھا جس کا اظہار وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے خود ہی اور انائے مطلق، اور سپر مین کے فلسفے لفظ بہ لفظ مغربی فکر و فلسفے کا چربہ تھے۔ نطشے کا ابر ماش جو اقبال مرحوم کا پسندیدہ کردار تھا جس کی جھلک وہ جگہ جگہ دکھاتے رہے مگر اصلاً یہ کیا ہے یہ تو خود ایک خدا ہے جو خود تخلیق کرتا ہے مذہب اور سائنس دونوں کے اہداف کو اقبال مرحوم نے یکساں قرار دیا ہے یعنی حقیقت [Ultimate reality] تک پہنچنا لیکن یہ بات نا قابل یقین ہے سائنس اور مذہب کی تاریخ سے واقف کوئی بھی فرد آزادانہ تنقید کے ذریعے اس موقف کی فاش غلطی کو سمجھ سکتا ہے لیکن اقبال مرحوم جیسے عبقری نے اس عام سے فلسفے میں سخت ٹھوکر کھائی اور بہت سے لوگوں نے مذہب کی طرح سائنس کو بھی ایمانیات کے طور پر قبول کیا اقبال مرحوم نے خود اعتراف کیا کہ وہ Varieties of Experience اور Moral Values and the Idea of God جیسی کتابوں سے متاثر تھے اور ان سے بہت کچھ اخذ کیا ہے اخذ و استفادے کی یہ رو مغرب سے مخصوص رہی کاش اقبال مرحوم عربی پر عبور رکھتے اور ہماری امہات کتب سے براہ راست استفادہ کرتے تو مغرب کی یہ کتابیں ان کو ہیچ نظر آتیں۔

خطبہ اجتہاد اور ماجد صاحب

میرے مشورے سے اقبال مرحوم نے ماجد صاحب کو خطبہ اجتہاد اور دیگر خطبات ارسال کیے تھے ماجد صاحب نے نہایت سخت رائے دی انھوں نے اقبال مرحوم کو یہ بھی لکھا کہ علوم اسلامی پر عبور کے بغیر اسلام پر نقد بہت بڑی جسارت ہے آپ عربی زبان سے بھی کما حقہ، واقف نہیں اور صرف ترجموں سے مدد لے کر یا اہل علم کی معاونت سے اسلام کے مسلمات، قرآن وسنت اور تعامل امت سے ثابت شدہ امور، حتی کہ عقائد جنت دوزخ کے بارے میں بھی آپ آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں قرآن وسنت کو منہاج نہیں بناتے، یہاں تک تو معاملہ ٹھیک ہے کہ آپ تلاش حقیقت میں سرگرداں ہیں لیکن اس تلاش کے دوران تشکک اور ریب کی اس کیفیت میں آپ کی جانب سے ان مہمات مسائل میں اس رائے کا تحریری اظہار سیدھے سادھے لفظوں میں کفر ہے۔ یہ ماجد صاحب کا انداز تھا، دین کے معاملے میں وہ مداہنت برداشت نہ کرتے تھے۔ ان کے خط سے اقبال کو شدید ذہنی دھچکہ پہنچا۔ انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ کی علمی الجھنیں بجا ہیں لیکن آپ الجھن سوال کی صورت میں جید علماء کے سامنے پیش کیجیے پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو توقف کیجیے اعتراض کا مطلب یہ ہے کہ آپ دین میں تضاد تلاش کر رہے ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت نہیں آپ کو اللہ نے دوسری صلاحیتیں دی ہیں اس سے کام لیجیے، فقہ اور اجتہاد آپ کے دائرہ علم سے باہر کی چیزیں ہیں ان امور پر صرف وہ شخص کلام کرے جس نے اپنی عمر ان معاملات کی تہہ تک پہنچنے میں بسر کر دی ہو اور صدر اول سے لے کر آج تک کے تمام فقہی ذخیرے، اختلافات ائمہ، اختلافات مجتہدین، پوری اسلامی تاریخ اس کے مختلف ادوار وغیرہ پر اس کی فقیہانہ نظر ہو.....جس طرح آپ نے مغرب میں جا کر مغربی فکر و فلسفے کی تعلیم حاصل کی بالکل اسی طرح آپ کی یہ اولین ذمہ داری ہے بلکہ ذمہ داری نہیں آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ علوم

اسلامی کی تحصیل بالکل اس طرح اس کے مراکز میں جا کر کریں جب مغربی فلسفے کے لیے مغرب اور جرمنی جا سکتے ہیں تو اسلامی علوم کے لیے اس کے مراکز ومصادر سے رجوع کیوں نہیں کرتے ؟ انھوں نے اقبال کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ علامہ انور شاہ کشمیری سے علوم اسلامی کی تحصیل کریں پھر خطبات پر نظر ثانی کر کے شائع کریں۔ ماجد صاحب کا خیال تھا کہ اقبال مرحوم کے خطبات میں قرآن کی آیات کی تفسیر تمام اصولوں سے انحراف پر مبنی ہے سیاق وسباق کو پیش نظر رکھا نہیں گیا ہے اور مطلوبہ مفاہیم کے لیے دل پسند تشریحات کی ہیں، ان آیات سے غلط مفہومات اخذ کیے ہیں اس کی وجہ علم تفسیر سے آپ کی عدم واقفیت ہے علم تفسیر اور عربی پر عبور کے بغیر قرآن کی دل پسند تشریح آپ کے ایمان کے لیے بھی خطرہ ہے۔ کیوں کہ یہ بند ایک بار ٹوٹ گیا تو کچھ نہیں بچے گا اور اجتہاد کے نام پر الحاد کے دروازے چوپٹ کھل جائیں گے اس لیے تقلید کے حصار میں رہ کر ہی اجتہاد کیا جا سکتا ہے یہ جو آج کل تقلید کو جمود عقل دشمنی رجعت پسندی جہالت کہا جا رہا ہے اس میں قصور دونوں کا ہے یعنی ہمارا طبقہ مولوی جو اب علم سے کم بہرہ رکھتا ہے اور دوسری جانب مغرب کو جاننے والے جو صرف مغرب کو جانتے ہیں اور انھیں اسلام حقیر نظر آتا ہے سرسید کو دیکھو کیسی کیسی باتیں لکھتے ہیں لندن کی خادمہ انھیں ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی بیٹی سے بہتر نظر آتی ہے ایسے لوگ اجتہاد کریں گے تو کیا کریں گے مولوی نذیر احمد نے اسی لیے سرسید کی تفسیر پر جو تبصرہ کیا ہے ٹھیک تو کیا ہے۔ تبصرہ بہت بے ہودہ ہے، ثقاہت کے خلاف لیکن مولوی صاحب دہلوی تھے اور محاورے، روزمرہ پر عقائد، اکرام، تعظیم سب قربان کر دیتے تھے۔ اس کا ثبوت ''امہات الامہ'' ہے قرآن کے ترجمے میں زبان کس قدر کھردری ہے کھڑی بولی اور پڑی بولی سب پر عبور رکھتے تھے، یہی مزاج سود کو حلال ٹھہراتا ہے قرض سود پر دیتے تھے پیسے گن گن کر رکھتے تھے۔ مولوی بھی کہلاتے تھے ان کی وجہ سے بے چارے مولوی بہت بدنام ہوئے، پہلے صرف بنیے یا پٹھان سود خوری کے لیے مشہور تھے، ڈپٹی صاحب نے مولوی پر بھی سود خوری کا الزام ثابت کر دیا، لیکن ابن الوقت میں جو کچھ لکھا ہے لفظ بہ لفظ سچ لکھا ہے۔

اقبال مرحوم جدید علم کلام اور کسی عبقری فقیہہ کی ضرورت کے قائل تھے لیکن خود ان صفات سے متصف نہ تھے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کام ان کے تو کیا اور کسی کے بس کا بھی نہیں ہے لہذا وہ اجتماعی اجتہاد کی ضرورت کے بھی قائل ہو گئے تھے لیکن افسوس کہ اسمبلی اور ترکی انھیں اس کی علامتیں نظر آئیں ترکی کی اسمبلی کی روداد کو دیکھ کر کے اقبال مرحوم کا اسے اجتہاد قرار دینا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ مغرب کے فلسفے کا ان پر بے حد اثر تھا اور وہ اسلامی علوم وفنون پر اس درجہ انحصار نہیں کرتے تھے جس طرح مغرب کے فلسفے و علوم پر.....اقبال ترکوں کے الحاد کو اجتہاد کا ہم معنی سمجھتے تھے اور اسے بڑا کارنامہ قرار دیتے تھے اس موضوع پر ان سے بہت تند و تلخ تبادلہ خیالات بھی ہوا اور آخر میں وہ اس سے رجوع کر چکے تھے لیکن اس رجوع کا اظہار تحریری طور پر کرنے کی مہلت نہ ملی۔ اغنی دیس کی تردید اور ترکی کے مسلم جدیدیت پسندوں کے افکار کی

حمایت میں وہ لکھنا چاہتے تھے یا لکھ چکے تھے کیوں کہ اقبال مرحوم کے ذہن میں بہت طویل مدت سے یہ معاملات موجود تھے اور ممکن ہے انھوں نے بہت کچھ لکھ رکھا ہو بہر حال اقبال مرحوم ان مباحث پر مجھ ہیچ مداں کی رائے کے طالب ہوئے، ان مباحث پر خط و کتابت و تبادلہ افکار کا سلسلہ شروع ہوگیا جو ان کے انتقال تک جاری رہا۔ مغربی فکر و فلسفے سے مجھے زیادہ شغف نہ تھا۔ یہ الگ میدان ہے۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ اس بارے میں ماجد صاحب سے بھی رجوع کریں۔ ماجد صاحب مغربی فلسفے پر اچھی نظر رکھتے تھے اقبال مرحوم اجتہاد والے مقالے کو اوائل ۱۹۲۵ء میں کہیں پڑھنا چاہتے تھے میرا خیال تھا کہ انھیں توقف کرنا چاہیے تاکہ اس کے مزید پہلوؤں پر پرسوچ بچار ہو سکے۔ مسلم الہیات اور جدید فکر کے مابین اقبال مرحوم کو جو تفاوت نظر آتا تھا اس پر وہ رنجیدہ تھے ان کی کوشش تھی کہ وہ اس خلیج کو پاٹ دیں وہ مغرب کو اسلامی فکر کی توسیع سمجھتے تھے اور مغرب کی جدید سائنس سے بہت متاثر تھے اس میں مسلمانوں کے عروج و طاقت کے امکانات محسوس کرتے تھے۔ امام غزالیؒ سے سخت نالاں تھے اور سمجھتے تھے کہ غزالی اور قدیم متکلمین اور فقہا نے فلسفے کی مذمت کر کے مسلمانوں پر ترقی ارتقاء اور سائنسی انقلاب کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ اگر یہ فقہاء اور خصوصاً امام غزالیؒ پیدا نہ ہوتے اور عالم اسلام میں فلسفے کی موت واقع نہ ہوتی تو مسلمانوں پر زوال نہ آتا لیکن ان کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا کہ رسول اللہؐ اور صحابہ کرام کے پاس تو کوئی فلسفہ نہ تھا لیکن قیصر و کسریٰ کیسے فتح ہو گئے تھے لیکن اقبال مرحوم کا خیال تھا کہ فلسفے کے بغیر سائنس میں آگے بڑھنا مشکل ہے اور سائنس کے بغیر مغرب پر فتح پانا ممکن نہیں ہے۔ مادی اسباب ان کے یہاں اہم تھے۔ وہ مغرب کی تمام تر ترقی کو اسلام کا ہی اثاثہ سمجھتے تھے جو بہت بڑی غلط فہمی تھی اور رفتہ رفتہ یہ غلط فہمی دور ہوگئی تھی ان سے بار بار یہ پوچھتا تھا کہ اگر قرآن نے تفکرون تدبرون تعقلون کی دعوت دے کر تجربیت، حواس کے استعمال کے ذریعے مغرب کی اس ترقی کو ممکن بنایا اور رسول اللہ کی آمد سے ہی مغرب مغرب ہوگیا اور اسلام نے ہی تجربیت Impresicim، عقلیت Rationality ترقی [Development]، ارتقا [Progress] کا درس دیا اور قرآن و سنت و خلافت راشدہ کا عہد اسی لیے زرین دور تھا۔ خود عہد اسلامی میں سائنس کا وہ ارتقاء کیوں نہ ہوا جو مغرب میں ممکن ہوا۔ کیا کسی پیغمبر نے ایجادات سے انقلاب برپا کیا یا دعوت سے اور دعوت بھی ازل سے ابد تک ایک ہی رہی تھی تو حید خالص اگر سائنس ترقی کی اصل اساس ہے تو انبیاء کم از کم سائنس داں تو ہوتے اور انسانیت کے لیے کچھ ایجادات تو کرتے لیکن تاریخ اس تصور سے خالی ہے۔ سب سے مشکل کام انسان کو بدلنا، اسے تیار کرنا ہے۔ انبیاء مشکل ترین کام کے لیے مبعوث کیے جاتے ہیں۔ اقبال مرحوم اتفاق کرتے تھے، ان سے کسی نے یہ بھی استفسار کیا کہ کیا مغربی سائنسی ترقی کو براعظموں کی لوٹ مار، کالونیل ازم، افریقی غلاموں سے بیگار کے بغیر ممکن بنایا جا سکتا تھا؟ اقبال مرحوم نے اس پہلو سے مغرب کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ لوٹ کے مال، افریقی غلاموں سے بیگار کے بغیر سائنسی انقلاب برپا ہونا ممکن نہ تھا۔ کیا خلافت اسلامیہ یہ کام کر سکتی تھی؟ اندلس کی ریاست نے یورپ میں لوٹ مار کے ذریعے سائنس اور عیش و عشرت کی

ثقافت تعمیر کی، مناظر گیلانی صاحب نے اس موضوع پر معارف میں مضامین لکھے ہیں جس میں بتایا ہے کہ کس طرح لوٹ مار کی جاتی تھی۔ لوٹ کے مال سے اسپین کی سائنسی ترقی ہوئی، انجام کیا ہوا؟ آج وہاں کوئی مسلمان باقی نہیں رہا، دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے سامنے عاد ثمود اہرام مصر موجود تھے تو مسلمان قرآنی تجربیت کے ذریعے ان جیسی عمارتیں چودہ صدیوں میں کیوں نہ بنا سکے۔ یعنی ان میں نقل کرنے کی صلاحیت بھی نہ تھی۔ اس طرح پوری امت ایک ناکام امت ٹھہرتی ہے۔ سائنسی ترقی کے اس فلسفے کے نتیجے میں رسول اللہ پر زد پڑتی ہے کہ نعوذ باللہ اس پیغمبر کے زمانے میں تو کچھ نہ تھا۔ رسول اللہ کا گھر، مسجد نبوی، مدینہ النبی کے گھر عاد ثمود اہرام مصر کا عشر عشیر بھی نہ تھے۔ لہٰذا عہد رسالت سائنسی نقطہ نظر سے دنیا کا ناکام ترین معاشرہ تھا۔ جو ماضی کے علوم وفنون کا احیاء کرنے سے قاصر رہا اور چٹائی، پتوں، ٹاٹ، جھونپڑی کی ثقافت سے اوپر نہ اٹھ سکا۔ کیا کسی معاشرے کی کامیابی اور ناکامی کا پیمانہ صرف مادی پیمانے سائنسی ترقی اور عروج ہے۔ اقبال مرحوم سے میں نے یہ بھی پوچھا کہ اگر مغرب کی ترقی اسلام اور قرآن سے ممکن ہوئی تو روم، ایران، مصر، چین، یونان، موئن جودڑو اور ہزاروں مدفون تہذیبوں کی ترقیوں کو آپ کس پیغمبر اور کس کتاب سے منسوب کریں گے اقبال مرحوم کے پاس ان سوالوں کے جواب میں گہری خاموشی تھی کہتے تھے کہ بات اہم ہے غور کی ضرورت ہے اندلس ان کے یہاں اسلام کا استعارہ تھا بارہا پوچھا کہ اندلس جس پر آپ کو بہت ناز ہے اور جس کا نوحہ آپ نے درد سے لکھا ہے کیوں مٹ گیا اس کی وجہ سائنس اور دنیا میں حد سے زیادہ استغراق تو نہیں تھا اور وہ جدیدیت تو نہیں کہ وہاں نماز بھی مقامی زبان میں پڑھائی جانے لگی تھی۔ نہ اندلس رہا نہ نمازی رہے، نہ مساجد رہیں اسلامی عبادات میں مقامیت سمونے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اس معاشرے کی روحانیت کیا تھی کہ مسلمان اقلیت میں رہے تو ابن حزم کے حوالے سے کہتے تھے کہ ہاں مسلمانوں کی آبادی کی قلت مسئلہ بن گئی تھی۔

مدینہ کی جگہ اندلس نے لے لی:

انھیں اس بات کا قلق تھا کہ جدید مسلمان مدینہ کا ذکر اس والہانہ طریقے سے نہیں کرتے جس طریقے سے اندلس کا ذکر کرتے ہیں اور اندلس ایک آئیڈیل کے طور پر دیکھا جا رہا ہے جو ہماری روحانی پستی اور فکری زوال کا سبب ہے ان کے خیال میں مسلمان کا والہانہ لگاؤ اندلس سے نہیں مدینۃ النبی سے ہونا چاہیے اندلس کا مٹنا خود بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے کہ کیا سائنس اور ترقی مذہب وریاست کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ کیا صرف سائنسی ومعاشی برتری بقاء وغلبے کے لیے کافی ہے۔ کیا غلبہ صرف مادی ارتقاء مادی شان وشوکت کا نام ہے؟ اندلس میں تو ابن عربیؒ جیسے صوفی بھی موجود تھے لیکن اندلس بچ نہیں سکا۔ المقری نے اندلس والوں کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ کا ذکر کیا ہے۔ قصر زہرہ پر کتنا خرچ ہوتا تھا، یہ لوٹ مار کا پیسہ کہاں سے آتا تھا؟ کیا اس کا نام ترقی ہے؟ اسلام تو اس کے لیے نہیں آیا۔ کیا اسی لیے اندلس مٹا دیا گیا؟ اگر سائنس اور معاشی ترقی تحفظ کے ضامن ہیں تو اندلس، یونان، مصر کے فرعون، چینی تمدن، عاد وثمود سباء کیوں تباہ ہوئے

تباہ کرنے والے تو سائنس وٹیکنالوجی میں نہ ان سے آگے تھے نہ ان کے برابر تھے اقبال مرحوم نے مجھ سے ایک مرتبہ خود کہا کہ کبھی کبھی اپنی شاعری کا جائزہ لیتا ہوں تو یہ سوال پریشان کر دیتا ہے کہ مسلمانوں نے جب قیصر وکسریٰ کو فتح کیا تو ان کے پاس ایک کتاب بھی نہیں تھی ڈھنگ کی کوئی عمارت بھی نہیں تھی ان سے اچھے گھروں میں تو ہم رہتے ہیں۔ اس لیے نظریے کی اہمیت بہت زیادہ ہے ایک طاقت ور نظریہ سائنس اور اسباب دنیا سے زیادہ قوت رکھتا ہے خصوصاً وہ نظریہ جو اسباب کے بجائے مسبب الاسباب پر یقین رکھتا ہو اس یقین نے ہر دور میں دنیا بدل ڈالی ہے۔ مسلمانوں کا زوال اس یقین سے محرومی کے باعث ہوا۔ یقین طاقت ور ہو تو تاتاریوں سے شکست کا انتقام انھیں مسلمان کر کے لیا جا سکتا ہے۔ عروج کا واحد طریقہ صرف جنگ، جدال، سائنسی ترقی نہیں ہے۔ خصوصاً اس وقت جب ترقی کے لیے مطلوب شے کسی اور کی ملکیت ہو اور اس غیر کی مرضی کے بغیر ہمیں مل نہ سکتی ہو۔ مسلمانوں نے تاتاریوں کو عسکری شکست تو نہیں دی ان کو یقین دعوت اور تہذیب سے شکست دی۔ کیا وجہ ہے کہ ہم مغرب کو ان ہتھیاروں سے شکست دینا ناممکن سمجھتے ہیں، لیکن مغرب کے ہتھیار ان سے خرید کر یا اس کا علم ان سے سیکھ کر ان ہتھیاروں سے ہی مغرب کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نظریہ کتنا کمزور ہے۔ کیا مغرب آپ کو اپنے سائنسی علوم غلبے کے لیے دے دے گا؟ ظاہر ہے ایسا ممکن نہیں۔ لہٰذا آپ کا عروج ارتقاء، مشروط ہو گیا۔ مغربی علوم سے جب تک مغرب وہ علوم نہ دے آپ پسماندہ رہیں گے اسلام خارج کا محتاج ہو گیا۔ لہٰذا اقبال مرحوم کے اس فکر کے نتیجے میں عالم اسلام کا مقصد مطمع نظر ہدف صرف اور صرف مادیت رہ گیا۔ انقلاب اسلامی ایک روحانی انقلاب ہے لیکن یہ مادی ذرائع کے بغیر برپا نہیں ہو سکتا۔ کتنی عجیب بات ہے۔

اقبال مرحوم اور عربی زبان:

اقبال مرحوم نے بتایا تھا کہ وہ بعض مقامی علماء سے عربی کتب کا متن پڑھوا کر سنتے ہیں پھر وہ علماء ان عبارتوں کا ترجمہ وتشریح کر دیتے ہیں، پھر اقبال مرحوم ان کی سماعت کے بعد سوالات در سوالات کے ذریعے ان مباحث ومسائل کو سمجھنے کی سعی فرماتے ہیں، لیکن ان علماء کا مغربی فلسفے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ اقبال مرحوم کے فلسفیانہ سوالات کے تسلی بخش جوابات دینے کی اہلیت بھی نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ فلسفیانہ مباحث سے واقف نہ تھے۔ لاہور کے ایک عالم مولانا غلام مرشد سے بھی ان کے استفادے کی اطلاع ملی تھی۔ مگر مرشد صاحب خود مغرب سے شدید طور پر متاثر ہیں۔ ان کے بعض بیانات اور درس کی تفصیلات بہت افسوس ناک ہیں۔ لاہور کے علمی حلقوں میں ان کی شہرت بھی بہت اچھی نہیں تھی۔ ماجد صاحب کی تنقید کے بعد اقبال مرحوم نے خطبات کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ انھیں احساس ہو گیا کہ یہ مباحث اس قدر سادہ نہیں کہ انھیں امہات کتب کے تراجم کی سماعت کے ذریعے طے کر دیا جائے۔ غالباً کسی بیان میں اقبال مرحوم نے یہ کہا ہے کہ میں Islam as I understant it کے نام سے کتاب لکھ رہا ہوں وہ تمہید الفرقان کے نام سے

تعارف قرآن لکھنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔لیکن اس کا سراغ نہیں ملا۔میرے خیال میں خطبات اقبال مرحوم کا نام اگر تبدیل کر دیا جائے بلکہ خطبات اقبال مرحوم کا بہترین نام میری نظر میں Islam as I understand it ہونا چاہیے کیونکہ خطبات میں صرف وہی کچھ پیش کیا گیا ہے جو اقبال مرحوم سمجھتے تھے،خود اسلام کوعلوم اسلامی علماء اسلام اور تعامل امت کے ذریعے سمجھنے کی روایت اقبال مرحوم نے ترک کر دی لہٰذا قدم قدم پر ٹھوکر کھائی،اسلام کو ذات رسالت مآب اور صحابہ کرام کی سیرت اور اجماع امت کے بغیر محض اپنی خودی اور عقل کے بل پر سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ماجد صاحب کے خط نے اقبال مرحوم کی ہمت شکستہ کر دی تھی۔انھوں نے اس تنقید کی روشنی میں خطبہ میں بہت سی ترامیم کیں،تغیرات کیے،نظر ثانی کا یہ سلسلہ کئی مہینوں تک چلا،لیکن ماجد صاحب کی خواہش کے باوجود اقبال مرحوم نے انھیں نظر ثانی شدہ مسودہ ارسال نہیں کیا۔انھیں خدشہ تھا کہ ماجد صاحب اس سے بھی مطمئن نہ ہوں گے۔مجھے یہ مسودہ ارسال کیا گیا تھا۔اس پر میرے کچھ تحفظات تھے اور تنقید بھی،اقبال مرحوم کو قلق تھا کہ علماء نے ان کے خطبات کا خیر مقدم نہیں کیا۔وہ علماء کی طاقت سے بخوبی واقف تھے اور تن تنہا ان سے مقابلہ کی سکت نہ پاتے تھے۔انھیں ملال تھا کہ سرسید نے علماء کا جو اثر کم کر دیا تھا وہ خلافت کمیٹی کی سیاست کے باعث دوبارہ بحال ہو گیا ہے اور اسی اثر سے وہ خائف تھے،ماجد صاحب کی تنقید نے اقبال مرحوم کو بہت محتاط بنا دیا تھا۔یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے ورنہ اقبال مرحوم جیسے قیمتی شخص کے قلم سے دشمنان اسلام کو بہت مہمیز مل سکتی تھی۔

علامہ کے مقالے اجتہاد پر ماجد صاحب اور بے شمار لوگوں نے اپنے اپنے طریقے سے نقد کیا، اگر اقبال مرحوم اس نقد کو قبول کر لیتے تو ان کا پورا خطبہ یکسر بدل جاتا،جن اکابر علماء نے اس خطبے پر نقد کیا ان کے خطوط کبھی شائع نہیں کیے گئے،شاید ابھی تک ماجد صاحب کا خط بھی شائع نہیں ہوا۔اقبال مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء نے بھی اس کی اشاعت کا اہتمام نہیں کیا ورنہ بہت عمدہ مباحث سامنے آتے، اجتہاد پر اقبال مرحوم کا خطبہ جو شائع ہو چکا ہے۔پہلے متن سے بہت مختلف ہے اس میں بھی انحرافات کے بہت پہلو ہیں لیکن پہلا متن تو بے حد غلط سلط تھا۔علماء کی تنقید سے اقبال مرحوم نے یہ بات سمجھ لی۔دینی مسائل میں ان کی داخل اندازی ان کے بس کی بات نہیں،لہٰذا وہ شاعری کریں اور ان امور تک محدود رہیں جن پر انھیں عبور حاصل ہو ورنہ دین چیستاں بن جائے گا۔صرف دین کی خدمت کا ارادہ کافی نہیں ہے،اس کے لیے مطلوبہ اہلیت بھی ضروری ہے۔اخلاص اور علم دو الگ راستے ہیں دونوں مل جائیں تو بڑی برکت ہو سکتی ہے۔ لیکن صرف اخلاص سے علم کی کمی پوری نہیں ہو سکتی۔

عہد حاضر میں اجتہاد کی شرائط:

عہد حاضر میں اجتہاد پہلے کی نسبت زیادہ مشکل ہے کیونکہ اب ہمارا سامنا ایک ایسے فلسفے سے

ہے جو یونانی فلسفے کی طرح مغلوب نہیں بلکہ دنیا میں غالب ہے۔ اس فلسفے نے علوم نقلیہ کا انکار کر دیا ہے اور عقل کو واحد ماخذ علم تسلیم کیا ہے۔ یہ فلسفہ مابعد الطبیعیات سے واقفیت کے لیے طبیعیات کو بے اثر پاتا ہے اور حقیقیت تک عقل کے ذریعے پہنچنا چاہتا ہے۔ جب کہ یونانی عقل کے ذریعے یہ ہفت خواں سر نہ کر سکے لہٰذا اب جو مجتہد ہو وہ صرف علوم اسلامی سے ہی واقف نہ ہو بلکہ اسے مغربی فلسفے اور جدید سائنس کے مباحث سے بھی کما حقہ، واقفیت ہو اس کے بغیر اجتہاد کرنا محال ہوگا، کیونکہ جدید مغرب نے جو سوالات پیدا کیے ہیں ان کا محرک ایجادات ہیں ایجادات کا محرک سرمایہ خواہش نفس، برتری، غلبہ اور انسان کے خدا ہونے کا دعویٰ ہے لہٰذا جدید مسائل کا فقہی جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ علوم نقلیہ کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ و حاضرہ پر ہماری نظر نہ ہو۔ مثلاً آج کل نیا رجحان جائیداد کی خرید و فروخت ہے، لوگ دو کانیں خرید کر رکھ لیتے ہیں، منڈی میں جب طلب بڑھتی ہے تو قیمتیں بڑھا کر بیچ دیتے ہیں اس کے نتیجے میں مکان جو بنیادی ضرورت ہے، اس قدر گراں ہو گیا ہے کہ عام آدمی مکان خریدنے کا تصور نہیں کر سکتا یہ بھی احتکار کی شکل ہے جس طرح گندم وغیرہ روک لینا اور پھر مہنگا بیچ دینا جرم ہے، تو اس سے زیادہ سنگین جرم میری نظر میں یہ کام ہے یورپ وغیرہ میں تو اب مکان خریدنا لوگوں کے لیے ممکن نہیں، کچھ عرصے بعد یہی صورت حال پاکستان میں ہوگی۔ یہ کیپٹل ازم کا نتیجہ ہے۔ اب اگر ہمارے مولوی صاحبان سے کوئی فتویٰ لے تو نہایت سادگی سے فتویٰ دے دیں گے کہ جائز ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ لوگوں کو بنیادی ضرورت سے محروم کرنے والا کاروبار کیسے حلال ہو سکتا ہے۔ حسب ضرورت جائیداد بنانا تو ٹھیک ہے لیکن اسے کاروبار بنا لینا اور ایسا کاروبار کہ عام آدمی کے لیے مکان خریدنا محال ہو جائے شریعت میں جائز نہیں۔ یہ مسئلہ عصر حاضر کا ہے لہٰذا کیپٹل ازم سے ناواقف علماء یقیناً اس کے جواز کا فتویٰ دیں گے اس لیے یہ ہیچ مداں کہتا ہے کہ علوم عقلیہ حاضرہ پر بھی مجتہد کی گہری نظر ہو۔ وہ اس عہد کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہو۔ اقبال مرحوم کا المیہ یہ تھا کہ وہ علوم حاضر سے واقف تھے لیکن علوم قدیم اور علوم نقلیہ سے سراسر ناواقف اس کا ثبوت خطبات میں قرآنی آیات سے غلط استنباط ہے۔ خطبات میں نوے فی صد آیات کھینچ تان کر سیاق و سباق سے کاٹ کر مطالب اخذ کیے گئے ہیں۔ علمائے کرام کا المیہ ہے کہ وہ دینی علوم سے بخوبی واقف اور فلسفہ مغرب و سائنس سے قطعاً ناواقف ہیں۔ ندوہ بنایا گیا تھا کہ فلسفہ سائنس پڑھایا جائے گا، شاہ سلیمانؒ پھلواری کا خطبہ وضاحت کرتا ہے جو ندوہ کی تاسیس میں پڑھا گیا تھا لیکن عملاً کچھ نہیں ہوا لہٰذا علماء اور جدیدیت پسند مفکرین کی حالت یکساں ہے جو صرف ایک دنیا سے واقف ہیں دوسری سے ناواقف جس طرح علماء جدید دنیا کے معاملے میں جہل کا شکار تھے۔ اقبال مرحوم دینی علوم کے معاملے میں جہل سے قریب تھے۔ دونوں دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔ ندوۃ العلماء میں مغربی فلسفہ و سائنس نہیں پڑھایا جا سکا تو باقی دینی مدارس سے کیا شکایت عالم عرب میں بھی یہی حال ہے۔ فلسفہ دراصل الہامی مذہب کا اصل مدمقابل ہے، اسے ہم عقلی مذہب کہہ سکتے ہیں لہٰذا اس مدمقابل مذہب سے واقفیت کے بغیر جدید مسائل کے سلسلے میں اجتہاد اگر کیا گیا تو وہ الحاد کے دائرے میں اضافے کا سبب

بنے گا اس سے مسلمانوں کو اور اسلام کو فائدہ پہنچنا مشکل ہے لہٰذا ان حالات میں قدیم فقہا کا عاقلانہ نقطہ نظر صادق آیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ معاشرہ اور علماء جب وہ صلاحیتیں پیدا کرنے کے لیے تیار نہیں جو اجتہاد کی لازمی شرائط ہیں تو ان کا خاموش رہنا بہتر ہے کیونکہ لوگ اگر کسی چیز کو اختیار کریں گے تو دل میں شک اور وسوسہ بہرحال رہے گا کیونکہ اس عمل کی دینی توثیق و تائید تو نہیں ملی یہ کھٹک اور چبھن ایمان کی سلامتی کے لیے ضروری ہے کیونکہ دل کا مفتی مطمئن ہو جائے گا تو یہ چبھن خود ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر علماء نے مغرب کو جانے بغیر محض چند باتوں کے ذریعے جزئیات پر فتویٰ دیا اور کلیات سے تعرض نہ کیا تو الحاد کو اجتہاد کے دائرے میں پناہ ملے گی جس سے حلت و حرمت کے پیمانے بدل جائیں گے اور الحاد کو اسلامی حصار میسر آ جائے گا۔ یہ خطرناک ترین صورت ہوگی فی الحال تو مجھے ایسا عالم نظر نہیں آتا جو اجتہاد کا اہل ہو کیونکہ مغرب سے واقف علماء آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، چند علماء نے انگریزی سیکھ لی ہے لیکن انگریزی سیکھنا اور فلسفہ جاننا دو مختلف دیناؤں کا سفر ہے۔ ہمارے علماء کو جرمن اور فرانسیسی زبان سیکھنی چاہیے، فلسفے کے تمام امام ان زبانوں میں ملیں گے، انگریزی ترجموں کے ذریعے بھی فلسفہ پڑھا جا سکتا ہے لیکن مجھے اس میں شک رہے گا کہ اصل متن کیا تھا؟ مسلم فلاسفہ پر اس سلسلے میں مغرب نے نقد کیا ہے کہ وہ جن افکار کو افلاطون سے منسوب کر رہے تھے وہ فلاطینوس کے تھے، ان کا اعتراض ہے کہ عرب افلاطون کے افکار ارسطو کے نام سے بیان کر رہے تھے۔ کیونکہ فلسفہ یونان ترجمے کے ذریعے سیکھا گیا لہٰذا یہ غلطی ہوئی ہوگی لہٰذا فلسفہ کو اس کی اصل زبان میں پڑھنا ضروری ہے۔ استاد مرحوم مولانا شبلیؒ آخر عمر میں فرماتے تھے کہ صرف انگریزی سے کام نہیں چلے گا۔ علماء کو کم از کم دو یورپی زبانیں سیکھنا ہوں گی تاکہ فلسفہ کے ماخذات کا براہ راست مطالعہ کر سکیں۔ ندوہ میں انگریزی پڑھائی گئی لیکن یورپی زبانوں کی تدریس کا خیال کسی کو نہیں آیا۔

اقبال مرحوم نے خطبات کا نام Re-Construction رکھا، مجھے اس پر بھی اعتراض تھا، تعمیر نو یا تشکیل نو کا کیا مطلب؟ کیا عمارت منہدم ہوگئی۔ تشکیل نو کا مطلب دین کی از سر نو تعمیر کے سوا کیا ہے یعنی اسلام کی اصل شکل مسخ ہوگئی۔ اب اسے از سر نو تعمیر کیا جائے۔ یہ دعویٰ پوری اسلامی تاریخ کو مسترد کرنے کے سوا کیا ہے؟ ان امور میں اقبال مرحوم مغرب سے اس قدر متاثر ہیں کہ اسلامی دنیا کو تیزی سے روحانی طور پر مغرب کی طرف بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس پیش رفت کی تحسین فرماتے ہیں، اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ فکری سطح پر یورپ کی تہذیب اسلامی ثقافت کی توسیع شدہ ترقی یافتہ شکل ہے، وسعت کے امکانات اسلام کے بیج میں تھے، لیکن درخت مغرب میں نکل آیا یہ عجیب تضاد ہے، افغانی سے اقبال مرحوم تک اسلام میں لوتھر کی ضرورت کا اثبات یہ ثابت کرتا ہے کہ سرسید افغانی، ابوالکلام، اقبال مرحوم وغیرہ اسلام کو Protestanzie کرنے کے حامی تھے۔ ورنہ اسلام کی تعمیر نو کی بات عجیب بات ہے۔ اسی بات کو کبھی عقلیت پسندی، کبھی تجدید مذہب کا نام بھی دیا گیا ہے اور کبھی اس کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ وہ لوتھر کی تحریک

اصلاح کے منفی مضمرات کے قائل تھے حالانکہ پروٹسٹنٹ ازم نے جس قسم کی اباحیت کو جنم دیا، علماء اور فقہاء کی حیثیت کا جس طرح خاتمہ کیا، سرمایہ دارانہ نظم و تنظیم کے خادم کا جو فرض ادا کیا چرچ آف انگلینڈ کی صورت میں غیر اخلاقی طرز زندگی کو مذہبی جواز مہیا کرنے کا جو کام کیا اقبال مرحوم اس سے صرف نظر کرتے ہیں یعنی وہ مغرب کی صنعتی ترقی، مذہبی انحطاط وغیرہ کی تاریخ پر بھی بہت گہری نظر نہیں رکھتے تھے۔ استعماریت کی تاریخ، کالونیل ازم کی تاریخ براعظموں میں یورپی لوٹ مار ہندوستان چین کی دولت لوٹنے کی تاریخ براعظم امریکہ پر قبضہ افریقہ میں سونے کی کانوں پر قبضہ افریقی غلاموں سے صنعت میں بیگار ان مباحث کے بغیر مغرب کو سمجھنا مشکل ہے۔ اقبال مرحوم مغرب کی ترقی کو ان تمام مباحث سے کاٹ کر غیر اقداری [Valu Nutral] سمجھ کر اس کو اسلامی منہاج میں داخل کرنا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان استخلاف فی الارض کے حقدار بن جائیں۔ لیکن کیا استخلاف فی الارض صرف سائنس وٹیکنالوجی اور ترقی سے ملتا ہے۔ کم از کم قدیم صحف سماوی اور قرآن حکیم اور انبیاء کے باب ہمیں ایسی رہنمائی نہیں دیتے۔ اقبال مرحوم نے خود اس نکتے پر غور کیا تھا اور مجھ سے استفسار کیا تھا کہ قرآن حکیم اور تاریخ انسانی کی روشنی میں یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جدید لوگوں کے یہ دعاوی کہ طاقت کا جواب طاقت، علم کا جواب علم، سائنس کا جواب سائنس اور ٹیکنالوجی کا جواب ٹیکنالوجی سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ ایک باطل دعوی ہے اور سراسر مادیت پرستی کے مظاہر کی پرستش کا نام ہے۔ اگر یہ دعویٰ اور فلسفہ حق ہوتا تو قوم لوط عاد و ثمود، اصحاب ارم، قوم سباء کو مٹانے والوں کے پاس اسی درجے کی سائنس وٹیکنالوجی صنعت و حرفت ہوتی۔ حضرت موسیٰؑ کے پاس تو فرعون کے زمانے کی سائنس و ٹیکنالوجی نہ تھی، مگر مصر تسخیر ہو گیا، قیصر و کسریٰ جب فتح ہوئے تو مسلمانوں کے پاس مسجد نبوی بھی کھجور کے تنوں اور چٹائیوں پر کھڑی تھی لہٰذا طاقت کا اصل سرچشمہ علم، سائنس وٹیکنالوجی نہیں وہ صحیح عقیدہ ہے جو روح کے اندر سما جائے اور خالق ارض و سماء کی قوت پر اسے وہ یقین حاصل ہو جو ایران فتح کرنے والوں کو تھا جب حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ تم مغلوب صرف گناہ کی وجہ سے ہو سکتے ہو، گناہ گار کبھی غالب نہیں آ سکتا، یہ یقین اس درجے کا ہو جو حضرت ابوبکر کو حاصل تھا جب فتنہ ارتداد کے مقابلے کا اعلان کیا، فرمایا جو اونٹ کی رسی دینے سے بھی انکار کرے گا اس سے بھی جنگ کروں گا، ان کا یقین یہ تھا کہ کوئی باقی رہے یا نہ رہے حق کو باقی رہنا چاہیے، اس یقین کا نتیجہ دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ورنہ عقلی و استدلالی طور پر صحابہ کا آپؓ کو مرتدین سے جدال پر توقف کا موقف بہ ظاہر غلط نہ تھا لیکن اللہ والے دل کی آنکھ سے حقیقت کو دیکھتے ہیں انھیں حقیقت دکھا دی جاتی ہے۔

امام غزالیؒ نے اجتہاد کو علم قرار دیا ہے۔ اقبال مرحوم نے اس کا مقصود کسی قانونی مسئلے پر آزادانہ رائے قائم کرنا قرار دیا ہے۔ المستصفیٰ میں اجتہاد کی جامع تعریف بیان کی گئی ہے۔ اجتہاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تقلید ترک کر دی جائے۔ فقہی مذہب چھوڑ دیا جائے، تلفیق کے نام پر اتحاد امت کی بات کی جائے۔

ساحل جون ۲۰۰۶ء

اجتہاد کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر عہد میں تقلید کو ممکن بنا سکے اور کتاب وسنت کو اس ضمن میں مرکزی مقام حاصل ہو، کیونکہ تقلید بھی دین کے ماخذات سے اصول اخذ کرتی ہے اور عدم تقلید بھی ماخذات دین کا انکار نہیں کرتی۔ جمہور کے اصول تو یکساں ہیں فروعات میں اختلافات ہیں۔ تلفیق کے بغیر بھی آخر یہ امت اجماع پر قائم ہوئی یا نہیں۔ اہل حدیث آج بھی حنبلیوں کے ساتھ موانست رکھتے ہیں۔ کیا حنبلی مقلد نہیں ہیں اور اہل حدیث غیر مقلد لیکن رشتہ محبت تو قائم ہے، تقلید اور عدم تقلید میں۔ اس امت میں اجتہاد ہوتا رہا ہے، اس کا دروازہ حکمت کے تحت بند کر دینے کے بعد بھی کبھی بند نہیں ہوا۔ آخر ہمارے زمانے میں مفقود الخبر شوہر اور عورت کے مرتد ہو جانے پر نکاح ٹوٹنے کا مسئلہ ان پر اجتہادات ہوئے یا نہیں؟ شاتم رسول کے مسئلے پر بھی تو امت نے اجتہاد کیا ورنہ فقہ حنفی میں غیر مسلم شاتم رسول تو قتل کی سزا سے بری ہے، سزا صرف مسلم کو دی جا سکتی ہے کیونکہ غیر مسلم جب رسالت محمدی پر ایمان ہی نہیں رکھتا تو وہ سزا کا مستوجب کیوں ہوگا۔ لیکن اب احناف بھی شتم رسول کو واجب القتل جرم قرار دیتے ہیں جب کہ ان کی امہات کتب میں اس مسئلے کا جواب مختلف ہے، فقہ مالکی شاتم میں مذہبی تفریق نہیں کرتی۔ اندلس میں عیسائیوں نے توہین رسالت کی ایک مہم شروع کی، ہزاروں سرفروش کفن باندھ کر توہین رسالت کے لیے نکل آئے پہلے تو شاتم کو قتل کی سزا دی گئی لیکن جوش و خروش بڑھ گیا اور معاملہ سنگین ہو گیا تو پھر عیسائی پادریوں کے ذریعے اس مسئلے کا حل تلاش کیا گیا۔ عصر حاضر میں اجتہاد الحاد کا مترادف ہو گیا ہے اور اس کا مقصد محض آزادانہ بے باکانہ رائے ہے، لوگ صرف اپنی اپنی آوازیں سننے کو تحقیق اور اجتہاد سمجھ رہے ہیں۔ اپنی تاریخ، اپنے علوم، اپنے احوال وظروف کو مسترد کر کے اجتہاد آزادی فکر کا نام ہو گیا ہے جو خالصتاً مغربی نقطہ نظر ہے جو کسی خارجی ذریعہ علم کا انکار کرتا ہے اور عقل پر تمام علم کا انحصار رکھتا ہے۔ اجتہاد میں معیار اور مرجع بہر صورت سلف رہیں گے لیکن جدید اجتہاد میں مرجع ترقی دنیا اور لذات دنیا کے حصول میں شرعی حیلوں کو تراشنے کا نام اجتہاد رکھ دیا گیا ہے۔ اقبال مرحوم نے اجتہاد کو اصول حرکت قرار دیا ہے، ان کے پیش نظر مغربی فکر وفلسفے میں حرکت کی اصطلاح تھی وہ حرکت میں زندگی دیکھتے تھے جس نے مغرب کے زمین وآسمان بدل ڈالے تھے۔ جب وہ عالم اسلام پر نظر ڈالتے تھے تو انھیں جمود نظر آتا تھا۔ یہ جمود جن تاریخی اسباب سے پیدا ہوا تھا ان اسباب کا غائر مطالعہ کرنے کے بجائے اقبال مرحوم نے سیدھے سادھے لفظوں میں مستشرقین کے مغالطوں کو ترجمہ کر کے ''تقلید'' اور تصوف، عجمی اثرات، ایرانی تصوف، کو اس جمود کا ذمہ دار قرار دیا۔ مغرب میں حرکت کسی خارجی ذریعے کی محتاج نہیں ہوتی لہٰذا حرکت کی خالص مغربی اصطلاح کو اسلامی منہاج میں برتتے ہوئے اقبال مرحوم نے اس کی نزاکت کا اندازہ نہیں کیا۔ بہ ظاہر یہ اصطلاح بہت دل کش لگتی ہے لیکن اس کے اثرات بہت روح فرسا نکلے ہیں۔ ترکی میں حرکت کا انجام سامنے ہے۔ اقبال مرحوم کو اس کا اندازہ ہی نہیں تھا کس طرح عربی زبان کو مٹایا گیا، کیسے اذان پر پابندی لگی؟ کس طرح دینی مدارس بند کیے گئے؟ عمامہ پہننا حرام ٹھہرا، عربی زبان کی کتابیں تلف کر دی گئیں، ایک دور یہ بھی آیا کہ تجہیز وتکفین کے لیے کوئی مولوی دستیاب نہ تھا۔ یہ حرکت کی

برکت تھی، آخر حکومت ترکی کو خود دینی تعلیم اور دینی مدارس کا انتظام کرنا پڑا۔ یہ برا بھلا انتظام ایک نئے نظام میں ڈھل رہا ہے۔ اغنی دیس نے اسلامی قانون کو نیوٹن کے قوانین کی طرح معین سمجھا[Determine] اور اقبال مرحوم نے اس کے برعکس چراغ علی کی طرح ان میں زبردست حرکت کا مشاہدہ کیا جس طرح نیوٹن کے قوانین جامد تھے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، جس طرح کائنات ایک مشین کے کل پرزوں کی طرح متعین طریقے کے مطابق حرکت کرتی ہے یعنی کائنات انہی متعین قوانین کے تحت چل رہی تھی، اسی طرح اس نے اسلام کے قانون فقہ کو جامد، ٹھہرے ہوئے پتھر کی لکیر قوانین قرار دیا..... نہ وہ اسلامی قانون کی اصلیت سے واقف تھا نہ اقبال، لہٰذا اعتراض بھی غلط تھا اور اس کا جو جواب اقبال مرحوم نے دیا وہ بھی غلط تھا۔ اعتراض کرنے والے نے مغربی اصطلاح میں فقہ اسلامی کا المیہ بیان کیا، ازالہ امالہ کرنے والے نے مغربی اصطلاح کے ذریعے ہی اس کا جواب دیا۔

قرآن کریم کا مقصد انسانی فلاح کے عمومی اصول مہیا کرنا تھا اس کی تعلیم زندگی کو ترقی پسندانہ تخلیق کا عمل ٹھہراتی ہے وغیرہ وغیرہ اس طرح کے دعوے خطبات اقبال مرحوم میں بہت ملتے ہیں۔ یہ تمام دعوے اقبال مرحوم پر مغربی فکر و فلسفے کے حد سے زیادہ غلبے کا اثر ہیں سترہویں صدی سے پہلے پوری اسلامی تاریخ بلکہ ادیان سابقہ کے صحائف، دنیا کے تمام معاشرے، تہذیبیں، ترقی، فلاح، صلاح، تخلیق، حرکت، ارتقاء کے ان کا فرانہ تصورات سے عاری رہے جو فکر مغرب کے غلبے سے عام ہوئے حیرت یہ ہے کہ اقبال مرحوم مغربی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے اس کا تاریخی پس منظر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ اصطلاحات ایک خاص تاریخ تہذیب و ثقافت سے نکلتی ہیں وہ زماں و مکاں میں محصور ہوتی ہیں صرف انبیاء کی دعوت زمان و مکاں سے ماورا ہوتی ہے آفاقی ہوتی ہے لیکن اقبال مرحوم مغرب کے فلسفے اور اس کی اصطلاحات کو بھی آفاقی، غیر اقداری Value Nutral سمجھ کر نہایت سبک روی سے انھیں اسلامی تاریخ تہذیب فقہ میں داخل کرنے کی جسارت کرتے ہیں اس جسارت پر علماء کا احتجاج بے سبب نہیں تھا لیکن احتجاج کرنے والوں کو بات کہنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا وہ فتویٰ دے کر چپ ہو گئے اقبال مرحوم اپنے عہد کے اسالیب میں گفتگو کر سکتے تھے انھوں نے اپنی غلط سلط بات بھی نہایت سلیقے اور تہذیب سے کہی بلکہ خطبات میں اسلام کے نصوص پر بھی نقد اس قدر گھما پھرا کر کیا ہے کہ دس پندرہ مرتبہ پڑھنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ اس اسلام کے عقب میں تو صرف مغرب کا فلسفہ ہے، ان کی تحریر نہایت گنجلک ہے اور میرے خیال میں اقبال مرحوم نے ماجد صاحب کی شدید تنقید کے بعد احتیاط کے طور پر اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ طرز ایجاد کیا تھا تاکہ بات کہہ دی جائے اور گرفت بھی نہ ہو۔ اقبال مرحوم اسلام پر نقد کرتے ہوئے علماء و فقہاء اسلام سے حوالے لانے کے بجائے کفار محققین و مستشرقین کے حوالے اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں جو نہایت غیر ذمہ دارانہ عمل تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ علوم اسلامی سے بالکل واقف نہ تھے مثلاً حدیث کی حجت اور سنت کے

مقام کے موضوع پر وہ حدیث کی تنقید میں J Schacht اور گولڈ زیہر وغیرہ کے حوالے دیتے ہیں اور ان پر تنقید بھی نہیں کرتے یعنی دین کے دوسرے ماخذ سنت کی حیثیت مستشرقین کے ذریعے متعین ہوگی علماء نے اسی لیے اسے کفر سے تعبیر کیا تھا علامہ حضرت انور شاہؒ نے اقبال مرحوم سے ملاقات میں انہیں مشورہ دیا تھا کہ آپ دینی علوم کی تحصیل کریں جس طرح آپ نے مغربی علوم کی تحصیل کی ماخذات کے متن خود علماء کی رہنمائی میں ان علوم کے اصولوں کے تحت مطالعہ کریں اور علماء سے مذاکرہ کے بعد اپنی آراء کا اظہار کریں جب آپ سات سمندر پار سفر کر کے کفر کے علوم حاصل کر سکتے ہیں تو اسلامی علوم کے حصول میں وہی مشقت اٹھایئے اس کے بغیر سکوت اختیار کرنا بہتر ہے۔

اغنی دیس کی کتاب تھیوریز آف فنانس[Theories of Finance] میں اجماع کے ذریعے نص قرآن کی منسوخی کا نظریہ بعض علماء احناف اور معتزلہ کے حوالے سے پیش کیا گیا تھا لہذا اقبال مرحوم نے مجھ سے اس نظریے کے حوالے طلب فرمائے۔

یونانی الاصل عیسائی ترکی مفکر اغنی دیس کے اس ادعا کو اقبال مرحوم نے نہایت تحیر کے ساتھ محسوس کیا اس تحیر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ احناف اور معتزلہ کے فقہی ذخیرے سے واقف نہ تھے فقہی بصیرت رکھنے والا اور علم فقہ پر عبور رکھنے والے شخص کے لیے اس طرح کے مسائل حیرت انگیز نہیں ہوتے اقبال مرحوم جب ان سوالات کی تصدیق وتائید کے لیے علماء سے رجوع کرتے تھے تو ان دلائل کی بنیاد پر کوئی دعویٰ کرنے اجتہاد، انحراف کرنے یا نقطہ نظر پیش کرنے کا حق بھی صرف علماء کو حاصل تھا یہ اقبال مرحوم کا مقام نہیں تھا اغنی دیس کے استدلال کی بنیاد علامہ آمدی، قاضی شوکانی اور عبدالعزیز بخاری کے دلائل پر رکھی گئی تھی اور اقبال مرحوم ان تینوں کی کتابوں سے واقف نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں ذہانت دی تھی وہ صرف تخیل کے ذریعے ایسے ایسے سوالات پیدا کرتے تھے جو سالہا سال مطالعہ کرنے والوں کے ذہن میں بھی نہیں آتے یہ درا کی ان کو دل دردمند کے ذریعے ملی تھی جو امت کے لیے دھڑکتا رہتا تھا اجماع کی نص قرآنی سے منسوخی کے سوال پر میں نے مختصر جواب تحریر کر دیا تھا کہ شاید وہ فکر کی درا کی کے ساتھ فقہ اسلامی کے لٹریچر کی غواصی بھی فرمائیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا ان کا طریقہ کار یہی تھا کہ وہ مستشرقین، منکرین حدیث، ملحدین، مغربی فلاسفہ کی کتابوں میں پڑھ کر اسلام پر وارد اعتراضات جمع کرتے ان کی علمی تنقیح کے بجائے مختلف علماء کے سامنے اشکالات پیش کر کے ان علماء کے جوابات سے اطمینان قلب حاصل کرتے یعنی اقبال مرحوم اپنے اشکالات کے ضمن میں صرف اور صرف تقلید علماء پر بھروسہ کرتے تھے یہاں ان کی اجتہادی قوت کام نہیں کرتی تھی اپنے لیے تقلید ضروری سمجھتے تھے اور عالم اسلام کے لیے اجتہاد لازمی سمجھتے تھے۔ پارلیمنٹ کے حامل ارکان کو بھی اجتہاد کی اجازت دیتے تھے لیکن خود پابند تقلید اجتہاد فرماتے یعنی علماء سے استفادہ کر کے اپنی رائے پیش کر دیتے۔ اس تقلید کا یہ نتیجہ نکلا کہ انھوں نے میرے مختصر جواب کی بنیاد پر نہایت اعتماد سے اغنی دیس کے اس موقف کو کہ بعض حنفی اور معتزلی مصنفین کے نزدیک اجماع قرآن کو منسوخ کر سکتا ہے مسترد کر دیا

یہ مثال بتاتی ہے کہ اقبال مرحوم اپنے علمی دعووں کی دلیلیں دوسروں سے حاصل کر کے اپنے نام سے پیش کرتے تھے خطبات میں ایک اور مقام پر بھی اقبال مرحوم نے اسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ انھوں نے استاد مرحوم مولانا شبلیؒ کی کتاب ''الکلام'' سے حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب کا حوالہ اصل سے تقابل کے بغیر لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیا۔ یہ حوالہ درست نہیں تھا اور اس غلط حوالے سے جو استاد مرحوم مولانا شبلیؒ نے اخذ کیا تھا وہ بھی درست نہیں تھا۔ امت کا اجماع ہے کہ حدود زماں و مکان سے ماورا ہیں اور قیامت تک نافذ العمل شاہ صاحب کا بھی یہی نقطہ نظر ہے لیکن اقبال مرحوم اغنی دیس کی تردید میں اتنے آگے چلے گئے کہ انھیں اسلامی سزائیں بھی قابل تغیر، ترمیم، تنسیخ نظر آئیں اس سے وہ اصول حرکت و ارتقاء ثابت کرنا چاہتے تھے۔ استاد مرحوم مولانا شبلیؒ کے یہاں انھیں اپنے مفروضے کے حق میں حضرت شاہ ولی اللہؒ جیسے عالم کی تحریف شدہ عبارت مل گئی یعنی نتیجہ پہلے اخذ کر لیا تھا اور دلیل بعد میں تلاش کی گئی۔ مقصد صرف اغنی دیس کی تردید تھا خواہ اس سے اسلام کی تردید ہو جائے۔ امت کی تاریخ میں منکرین حدیث کی بھی کبھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ حدود کو صرف جزیرۃ العرب کے معاشرے تک محدود سمجھتے ہوں، لیکن اقبال مرحوم نے اسلام میں اصول حرکت و اجتہاد کو ثابت کرنے کے لیے نہایت نیک نیتی کے ساتھ حدود میں ترمیم، تبدیلی کا اصول بھی شاہ ولی اللہ جیسے جید عالم سے منسوب کر دیا۔ اقبال مرحوم کے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ استاد مرحوم کے اقتباس میں تحریف کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر وہ خطبات میں الکلام کے ثانوی ماخذ کا حوالہ دے دیتے تو انھیں شرمندگی نہ ہوتی، شاہ ولی اللہ کے نام سے غلط حوالہ پیش کرنا ایک ایسے خطبے میں جسے علماء کی نظر سے گزرنا تھا بڑی جرات کی بات تھی ماجد صاحب نے اس غلطی کو بھی واضح کیا تھا لیکن اقبال مرحوم پر یہ غلطی اس وقت واضح نہ ہو سکی۔ جب اقبال مرحوم پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ان سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے اور امت کے اجماع کے برعکس رائے دی گئی ہے اور دلیل بھی محرف ہے تو وہ دل گرفتہ ہوئے مجھ سے خط و کتابت کے ذریعے استفسار کیا۔ دوسرے علماء سے بھی رجوع کیا۔ خطبات پر نظر ثانی کا وعدہ کر لیا تھا لیکن مہلت نہ ملی۔ اقبال مرحوم کے مسودات میں نظر ثانی شدہ عبارتیں مل سکتی ہیں۔ اقبال مرحوم کہتے تھے کہ تمام عمر مغربی فلسفے میں بسر کی ہے لہٰذا اسلام کی تعلیمات اور فقہ کا مطالعہ بھی دانستہ یا نادانستہ مغربی نقطہ نگاہ سے کرتا ہوں۔ اقبال مرحوم کا نقطہ نگاہ شک سے شروع ہوتا ہے اور زیادہ بڑے شک پر ختم ہوتا ہے کیونکہ فلسفہ یقین کا نام نہیں وہ تو شک کا نام ہے شک کی وہ منزل کہ جب فلسفی خود اپنے آپ پر شک کرتا ہے اس کا تمام تر یقین شک پر ہوتا ہے۔ فلسفی کی زندگی تیقنات سے خالی رہتی ہے۔ خطبات کے سلسلے میں اقبال مرحوم پر جو حملے ہوئے اس نے انھیں از سر نو غور پر مجبور کر دیا تھا۔ آخری زمانے میں انھوں نے بارہا مختلف مجالس میں اعتراف کیا کہ میں نے مغرب کو منہاج بنا کر اسلام کو اس کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی۔ یہ طریقہ کار درست نہیں تھا، اسلام کو کسوٹی بنا کر مغرب کو اس معیار پر پرکھنا چاہیے تھا تاکہ اسلام اور مغرب کے مابین مغائرت دور کی جا سکے۔

اقبال پر مصری مفکر عبدالرازق کے اثرات:

خطبات کے سلسلے میں لاہور لکھنو، دہلی اور دیگر شہروں کے علماء سے ان کا رابطہ تھا۔ مولانا ابوالکلامؒ سے بھی وہ استفادہ کرتے تھے۔لیکن اس استفادے کا مسئلہ یہ تھا کہ جن علماء سے وہ استفادہ کررہے تھے ان میں سے کوئی بھی مغرب کے فکر وفلسفے سے اس سطح پر واقف نہ تھا جس سطح پر اقبال مرحوم واقف تھے لہٰذا یہ علماء اقبال مرحوم کو بہت اچھا مشورہ دینے کے اہل نہ تھے اقبال مرحوم پر مغربی فلسفے اور وہاں کے اساتذہ کا جو اثر تھا وہ حیران کن تھا لہٰذا میری رائے یہ تھی کہ وہ ماجد دریا آبادی صاحب سے اس بارے میں بہتر رائے حاصل کر سکتے ہیں۔مولوی احمد دین امرتسری سے صوفی تبسم اور علامہ عرشی نے رابطہ کرانے کی بہت کوشش کی لیکن اقبال مرحوم نے اس میں دلچسپی نہ لی انھیں اندازہ تھا کہ احمد دین امرتسری نہ صرف مغربی فلسفے سے ناواقف ہیں بلکہ علوم اسلامی میں ان کا خاص نقطہ نظر ہے اور اگر ان کے افکار اقبال مرحوم نے پیش کیے تو کم ازکم ہندوستان میں ان کی شخصیت بے اثر ہو جائے گی لہذا وہ بہت احتیاط برتتے تھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اقبال مرحوم جو قیام خلافت کے زبردست طرف دار ہیں وہ علی عبدالرازق کی کتاب سے کیسے متاثر تھے جو ریاست کو اسلام کے دائرے سے خارج کر دیتی ہے۔اقبال مرحوم کی پوری شاعری استخلاف فی الارض کی پکار ہے لیکن عبدالرازق تو خلافت اور ریاست کے وجود سے انکار کر دیتے ہیں اور اقبال مرحوم کے لیے پھر بھی ان کی کتاب اہم ہو جاتی ہے یہ گتھی کبھی میں سلجھا نہ سکا اقبال مرحوم کے یہاں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور عروج کے بارے میں اس قدر ولولہ پایا جاتا ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں یہ ولولہ خلافت کے بغیر مادی پیکر اختیار نہیں کرسکتا رازق اس مادی پیکر کا انکار کر دیتے ہیں اور اقبال مرحوم پھر بھی انھیں دل سے قبول کر لیتے ہیں اس کی.....توجیہہ کرنے کی بہت کوشش کی ناکام رہا۔

اقبال مرحوم پر افغانی کا اثر:

جمال الدین افغانی کے خیال میں حقیقت کی تلاش اور اس کے اظہار میں نبوت اور فلسفہ ایک ہی طرح کام کرتا ہے۔اقبال مرحوم نے افغانی کی فکر میں ترمیم کر کے یہاں فلسفے کو سائنس سے بدل دیا فلسفہ کم ازکم مابعدالطبعیاتی سوالات سے بحث تو کرتا ہے حقیقت کی تلاش اس کا موضوع تو ہے گو کہ اس تلاش کا ذریعہ صرف عقل ہے دوسرے لفظوں میں حق فرد میں محصور ہے۔فرد بتا سکتا ہے کہ کیا حق ہے کیا باطل ہے یعنی عقل کو فوقیت دے دی گئی تمام ذرائع علم پر لیکن سائنس تو حقیقت کے سوال سے بحث ہی نہیں کرتی اس کا مابعدالطبعیاتی سوالات سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اس نے حقیقت کو پانے کا کبھی دعوی ہی نہیں کیا۔سائنس کی تاریخ تجربات سے تو عبارت ہے لیکن حقیقت مطلق تک رسائی کبھی اس کا موضوع نہیں رہا قدیم سائنس کو کسی حد تک مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے کیوں کہ وہ فلسفے سے راست منسلک تھی لیکن جدید سائنس تو اپنی نہاد میں الحاد ہے اس سے مذہب کی تائید وتصدیق کی خواہش بڑی عجیب بات ہے اقبال مرحوم جیسے شخص سے اس خواہش کا

صدور بہر حال ہوا ہے۔

مذہب سائنس کا محتاج ہے:

روحانیت کے سلسلے میں اسلام نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی اس معاملے میں ہم بہت مالا مال ہیں اس میں کچھ رطب و یابس بھی ہے لیکن اس سے قطع نظر بہت کچھ قیمتی سامان بھی مل جاتا ہے جس پر فخر کیا جاسکتا ہے ماجد صاحب کا خیال تو یہ تھا کہ اقبال مرحوم خطبات لکھنے کے زمانے میں مغربی فلسفے کے جدید انداز سے واقف نہ تھے سیاسی مصروفیات اور وکالت اور شاعری کے بعد وقت کہاں ملتا ہوگا لہذا مغربی فلسفے کے بدلتے ہوئے جدید رجحانات تک ان کی رسائی نہ تھی۔ جو کچھ وہ پہلے پڑھ چکے تھے اس پر ان کے علم کا مدار تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہ خطبات میں بہت سے خیالات سے رجوع کر لیتے مذہب کی تائید و توثیق کے لیے سائنسی افکار سے استدلال ایک مغالطہ پیدا کرتا ہے کہ ایک دوامی چیز کی تائید غیر دوامی یا ہنگامی شے سے کیسے کی جاسکتی ہے دوسرے لفظوں میں سائنس کی بنیاد عقل اور محسوسات و تجربات ہیں یعنی مذہب کو پرکھنے جانچنے کی بنیاد ہماری عقل اور ہمارے محسوسات ہوگئے یعنی حق مذہب نہیں بذات خود ہم ہیں حق کسی تائید اور خارجی توثیق کا محتاج نہیں وہ اول و آخر حق ہے چاہے اسے کوئی تسلیم کرے یا نہیں اللہ تعالیٰ کسی کی تصدیق کا محتاج نہیں ہے لیکن خطبات میں نظر آتا ہے کہ سائنس کی تصدیق کے بغیر مذہب پر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

ساحل

☆ ۲۰۰۵ء کے چند شمارے دستیاب ہیں۔

☆ ماہ فروری، اکتوبر اور نومبر کے صرف چار چار شمارے باقی ہیں۔

☆ جنوری ۲۰۰۶ء کے شمارے دستیاب نہیں ہیں۔

☆ فروری اور مارچ ۲۰۰۶ء کے چند شمارے دستیاب ہیں۔

☆ ہندوستان میں ترسیل کی سہولت میسر ہے۔

رسالے وصول کرنے کا طریقہ خود تجویز فرمایے